۱۴۰۱
۹ اگست ۸۱ء
۱/۷

# ماہنامہ

# المبشر

# اس شمارہ میں


| | |
|---|---|
| اداریہ | مدیر |
| اسرار التنزیل | مولانا محمد اکرم صاحب |
| ایک خواب کی تعبیر | محمد حبیب الرحمان صاحب |
| رمضان المبارک | حافظ عبدالرزاق صاحب ایم اے |
| کایا پلٹ گئی | پروفیسر باغ حسین کمال صاحب |
| کونی اعیاد اللہ | حافظ عبدالرزاق صاحب |
| ذکر الٰہی کیوں ادب کے | مولانا محمد اکرم صاحب |
| تصوف اور تعمیر سیرت | حافظ عبدالرزاق صاحب |
| خدایا ایں کرم بار دگر کن | حافظ عبدالرزاق صاحب |

# اداریہ

خواہشات کی غلامی کی بہیمانہ صفت سے جان چھڑا کر خواہشات پر حکومت کرنے کا انسانی وصف پیدا کرنے کا موسم آیا اور بیت گیا۔

انسانوں کی طرح جینے کا ڈھنگ سیکھنے کی رُت آئی اور چلی گئی۔

اللہ کی زمین پر اللہ کا بندہ بن کر زندہ رہنے کا سلیقہ سیکھنے کا بہار آفریں زمانہ آیا اور ختم ہو گیا۔

اپنے اندر جھانکو، اپنے دل کو ٹٹولو، اپنی سیرت کا جائزہ لو، اپنے کردار کی پڑتال کرو، اپنے معاملات پر نگاہ کرو، اپنے تعلق باللہ کی کیفیت کو جانچو، کوئی خوشگوار تبدیلی، کچھ خلوص کوئی للّٰہیت کوئی احتیاط کا وصف پیدا ہوتا محسوس ہوتا ہے یا دکھائی دیتا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ملتا ہے تو مبارک ہو کہ تم نے لعلکم تتقون سے اپنی استعداد اپنے ظرف اور اپنی محنت کے مطابق حصّہ پا لیا۔ تم خوش قسمت ہو۔ اہلِ سعادت میں سے ہو اس نعمت کا شکر جتنا بھی کرو کم ہے۔

اور اگر صورت یہ ہے کہ تم اخلاقی اعتبار سے اب بھی وہیں کھڑے ہو جہاں ایک مہینہ پہلے تھے قربِ الٰہی کی طرف تمہارے قدم اُٹھنے ہی نہیں پائے یا اُٹھتے ہی نڈھال ہو گئے تو اپنی محرومی پر، اپنی پست ہمتی پر، اپنی بدبختی پر جس قدر آنسو بہاؤ کم ہے۔ وقت گزر جانے پر بھی احساس محرومی اور احساسِ ندامت بھی افادیت سے خالی نہیں جب یہ احساس اگلے موسم کے انتظار کا شوق پیدا کر دے اور تلافیٔ مافات کے لئے محرک ثابت ہو۔

مدیر

مولانا محمد اکرم صاحب

# اسرار التنزیل

یہ خطبہ جمعۃ المبارک حضرت مولانا محمد اکرم صاحب مدظلہ العالیہ نے بمقام لاہور مورخہ ۵ رجون ۱۹۸۱ء کو ارشاد فرمایا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف الیل والنھار لاٰیات لاولی الالباب الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم ویتفکرون فی خلق السمٰوات والارض ربنا ما خلقت ھٰذا باطلاً سبحٰنک فقنا عذاب النار۔

بزرگانِ گرامی واحباب! پچھلے دو تین جمعوں کے موقع پر جو آیات کا ترجمہ اور تفسیر میں نے عرض کی تھی اُن میں بھی لُب لُباب بات کا یہی نکلا تھا کہ اگر انسان راہِ راست سے ہٹ جائے یا اللہ جلِ شانہٗ کی اطاعت چھوڑ دے تو، دنیا میں اُسے جو سزا دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ حتیٰ انسوکھم ذکری اللہ جلِ شانہٗ اپنی یاد اس کے دل سے بُھلا دیتے ہیں اور اپنا نام اس کی زبان سے چھین لیتے ہیں - ان آیاتِ کریمہ میں بھی خداوند کریم نے جہاں اپنی عظمت کی نشانیاں اپنی تخلیق کو فرمایا ہے کہ اللہ کی مخلوق اور اس کی تخلیقات جو یہ عالم میں ہر سُو بکھری پڑی ہیں خود آسمانوں اور زمینوں کا وجود اور ان کے عجائبات یہ موسموں کا تغیّر و تبدل دن اور رات کا آنا جانا یہ ایک ایسا مستقل اور مکمل نظام کہ کوئی ایک چیز کسی دوسری پہ اُور لیپ نہیں کرتی کہیں سے کوئی شے اپنی حدود سے متجاوز نہیں ہوتی اور کہیں کوئی چیز اپنا کام کرنا بند نہیں کرتی - تو یہی ایک اُس کی عظمت کو جاننے کے لئے بہت بڑی دلیل ہے کہ وہ کیسا قادر ہے اُس کی قدرت اُس کا علم اور اس کی قوت کس قدر وسیع ہے کہ ایک ایک ذرّے کو اس کی معلوم جگہ پہ اللہ نے سجا رکھا ہے - لیکن اس کو جاننے کے لئے اللہ کریم فرماتے ہیں نشانیاں تو بہت بڑی ہیں بہت واضح ہیں لیکن اس کے لئے عقل کی اور شعور کی ضرورت ہے - یہ نشانیاں ان لوگوں کے لئے ہیں (اولی الالباب) جو عقل رکھتے ہیں جو صاحبِ خرد ہیں جن میں کچھ شعور ہے - تو اللہ کریم فرماتے ہیں اگر عقل ہو عقل مند لوگ کون ہیں فرماتے ہیں جن میں عقل ہے وہ لوگ ہیں اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلیٰ جُنُوْبِھِمْ دانا تر وہ لوگ ہیں جو ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے ہوں بیٹھے ہوں، لیٹے ہوں، کسی حال میں ہوں سفر میں ہوں حضر میں ہوں، رات ہو، دن ہو محفل میں ہوں یا تنہا ہوں، بازار میں ہوں یا صحرا میں ہوں ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور پھر ذکر سے کیا ہوتا ہے - اس سے تفکّر پیدا ہوتا ہے

وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ ان نشانیوں کا بحیثیت ایک نشان کے اور بحیثیت ایک آیۃ اللہ کے ذہن میں تصور ہی تب آتا ہے جب وہ ذاکر ہوں اور انہیں ذکر دوام حاصل ہو اور جب وہ اس تفکر کو پالیتے ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ بات آتی ہے تو پھر وہ خود اس سے نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ کہ اتنا بڑا نظام جو ہے اس پر نتائج ضرور مرتب ہوں گے۔ کبھی ہو نہیں سکتا کہ یہ اتنا مربوط نظام بنا کر آخر میں بغیر کسی نتیجہ کے اسے بکھیر دیا جائے اور اسے ختم کر دیا جائے اور اس میں کسی نیک کو نیکی کا اجر نصیب نہ ہو اور کسی بدکار کو برائی پہ کوئی سزا نہ ہو۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنا طویل نظام بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اسی سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں اور انہیں یقین کامل حاصل ہوتا ہے کہ واقعی اللہ کی نافرمانی کا انجام دوزخ کی آگ ہے اور وہ عرض کرتے ہیں رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۔ اللہ یہ تیری تخلیق کوئی فعل عبث نہیں ہے، فضول کام نہیں ہے جس کام پہ کوئی نتیجہ مرتب نہ ہو وہ تو فضول ہوتا ہے وہ تو بچوں کی کھیل ہے۔ تو تب جا کر انہیں سمجھ آتی ہے۔ اللہ یہ کام یہ تخلیق کائنات کوئی فعل عبث نہیں ہے وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ اور اللہ ہمیں اپنی گرفت سے اور آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ اور بچا لے تو گویا دینی شعور یا دین آتا ہی تب ہے جب انسان کو ذکر دوام حاصل ہو یہ ذکر دوام فی نفسہٖ شے کیا ہے ہم مسلسل اسی موضوع پہ بات کر رہے ہیں تو تھوڑی سی بات یہ بھی ہو جائے کہ یہ ذکر اپنی ذات میں کیا ہے اور یہ کیسے کیا جاتا ہے اور یہ کس کس کے لئے ضروری ہے اور کس درجے پر پہنچ کر انسان اس کا محتاج نہیں رہتا سب سے پہلی بات تو یہی ہے یعنی کہ نوع انسانی میں کتنے افراد ہیں جنہیں ذکر کی ضرورت نہیں ہے اور جو اس سے مستغنی ہیں تو میرے خیال میں جہاں تک ہمیں قرآن حکیم سے راہنمائی ملتی ہے اللہ کی مکلف مخلوق میں کوئی فرد ایسا نہیں ہے جو اللہ کے ذکر سے مستغنی ہو اسی لئے خداوند کریم نے ذکر دوام سے محروم لوگوں کو غیر عقلمندوں میں شامل کیا ہے اور عقلمند و دانا انہی کو کہا گیا ہے جو ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو گویا جو ذاکر نہیں ہیں وہ عقلمند نہیں ہیں عقلمند کون ہوتا ہے؟ وہ ہوتا ہے جسے اپنی ضرورت کا احساس ہو۔ آپ جنہیں دیوانہ یا پاگل کہتے ہیں کیوں کہتے ہیں اس لئے کہ انہیں احساس ضرورت نہیں رہتا۔ انہیں یہ احساس نہیں رہتا کہ مجھے لباس پہننا ہے یا نہیں ننگا ہوتے ہوں انہیں یہ احساس و شعور نہیں رہتا کہ میں دھوپ میں ہوں یا سایہ میں ہوں، انہیں یہ احساس نہیں رہتا کہ مجھے بات کس طرح سے کرنی ہے اور کونسی بات کرنی ہے تو گویا جب انسان احساسِ ضرورت سے محروم ہو تو وہ دیوانہ ہے یا پاگل ہے عقلمند نہیں ہے باہوش و باخرد انسان نہیں ہے، تو یہ جو ذکر دوام ہے یہ ہر فرد کی بہت بڑی ضرورت ہے چونکہ یہ بنیاد ہے تفکر کی اور تفکر بنیاد ہے معرفت الہٰی کی اور عظمت باری کو پانے کی تو جب وہ اس بنیاد ہی سے محروم ہوتا ہے وہی پاگل اور دیوانہ کہلاتا ہے ہم افراد انسانی کو اگر دیکھیں تو مختصر اً اس پوری کائنات میں سارے عالم بسیط میں ارض و سما میں سے

رخِ مصطفٰے ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا کوئی بھی آئینہ
نہ ہے میری چشم خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

ایک ذات ایسی بھی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کے ساتھ کی کوئی دوسری ذات رب العالمین نے پیدا ہی نہیں فرمائی خدا کے اس سارے نظام میں اس سارے کارگہِ حیات میں اللہ سے قریب تر اللہ جل شانہ کے ہاں ساری مخلوق سے معزز و مقرب اور ساری کائنات میں بزرگ و برتر ؎

آن کہ آمد نہ فلک معراج او
انبیاء و اولیاء محتاج او

ساری کائنات رحمتِ باری کو پانے کے لئے جس ہستی کی محتاج ہے اگر ذکر سے استغنا حاصل ہو سکتا تو یقیناً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اس کی ضرورت نہ رہتی زندگی کے کسی شعبے میں دیکھیں آپ حکومت و سیاست سے لے کر جہاد اور جنگوں تک تبلیغ ہو یا وعظ ہو خانہ داری ہو معاشرہ ہو شہری مسائل ہوں یا کاروبار و تجارت ہو زراعت ہو یا جانوروں کے پالنے کا شعبہ ہو زندگی کا کوئی شعبہ ہو اس میں قیادت اور سیادت ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی شعبہ حیات میں کوئی شخص خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ عالی کو نہ پا سکا۔ تو جب ان تمام خصوصیات کی حامل ذات کی بات آتی ہے تو براہِ راست حضور سے خطاب فرماتے ہوئے اللہ کریم فرماتے ہیں۔ وذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا۔ کہ اے میرے محبوب اپنے رب کے نام کی تکرار کرتا رہ۔ اسمِ ذات کو اللہ کے نام کو اس طرح سے ذکر کرتا رہ اللہ اللہ اللہ اللہ اس کثرت سے کرتا چلا جا تبتل الیہ تبتیلا کہ چہار دانگ عالم میں صرف اللہ رہ جائے اور ساری کائنات تیرے ذہن سے محو ہو جائے۔ کلی انقطاع ساری مخلوق سے حاصل ہو جائے اس شدت سے اور اس کثرت سے ذکرِ الٰہی کرتے رہیئے، تو جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو صاحبِ معراج بھی ہیں جو امام الانبیاء بھی ہیں اور جو اس کا مصداق ہیں کہ ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

جب وہ ذکرِ الٰہی سے مستغنی نہیں ہیں تو دنیا میں کوئی ایسا فردِ نوعِ انسانی کا نہیں ہے جو ذکرِ الٰہی بھی نہ کرے اور وہ سمجھے کہ مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اگر کسی کے ذہن میں یہ بات ہے وہ احساسِ ضرورت سے عاری ہے اور اسی لئے قرآنِ کریم نے اس کا ہوش مندوں میں شمار ہی نہیں کیا۔ قرآن کریم کی نگاہ میں وہ شخص عقل مند نہیں ہے دانا نہیں ہے صاحبِ خرد نہیں ہے۔

تو جب ذکر اس قدر ضروری ہے، جب یہ براہِ راست حکم ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تو کیا حضور ذکر نہ کرتے ہوں گے کوئی مسلمان یہ بات سوچ سکتا ہے۔ کہ اللہ کی طرف سے براہِ راست خطاب فرما کر حکم دیا جائے۔ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کو اور نبی سے نبی کی ذات سے یہ توقع وابستہ کی جا سکتی ہے کہ وہ اللہ کے حکم کی تعمیل نہ کریں اور پھر امام الانبیاء آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قلبِ اطہر اس طرح سے ذاکر تھا کہ کوئی عارضہ آپ کے قلبِ اطہر کو اللہ کی یاد سے روک نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ نیند جسے موت کی بہن کہا جاتا ہے اور جو انسانی ذہن کو یا انسانی شعور کو بالکل معطل کر دیتی ہے وہ نیند بھی قلبِ اطہر کو خواب میں مبتلا نہ کر سکی حضور فرماتے ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ عینای تنامان ولا ینام قلبی

اور کما قال صلی اللہ علیہ وسلم کہ نیند کا اثر بھی میری آنکھوں پر تو ہوتا ہے۔ لیکن میرے دل کے پاس سے نہیں گزر سکتا وہ باقاعدہ اپنے کام میں لگا ہی رہتا ہے اسی لئے نوم انبیاء جو یہ ناقص وضو نہیں ہوتی۔ کسی بھی نبی کی نیند جو ہے وہ وضو کو باطل نہیں کرتی۔ کیوں اُن پر نیند اس طرح سے غالب ہی نہیں ہوتی کہ ان پر غفلت آجائے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حق دولت کے امین ہیں اور جو سب سے بڑا سبب ہے معرفتِ باری کو پانے کا اور جو سب سے بڑا ذریعہ ہے اللہ کے قرب کو حاصل کرنے کا رحمتِ الٰہی کو پانے کا کیا آپ اس دولت کو تقسیم کرنے کے بھی مکلّف ہیں کہ نہیں جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکلّف ہیں احکامِ الٰہی کو اللہ کی مخلوق تک پہنچانے کے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس حکم کو جو اللہ کی طرف سے حضور پر نازل ہوا اللہ کی مخلوق تک پہنچایا بلکہ خطبہ حجۃ الوداع میں یہ بات ملتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جملہ حاضرین کو خطاب فرماتے ہوئے استفسار فرمایا تھا، پوچھا تھا کہ کیا میں نے اللہ کا دین تم لوگوں تک پہنچا دیا بالکل درست طریقے سے تو سب نے گواہی دی تھی کہ بے شک آپ نے اللہ کے احکام ہم تک پہنچا دیئے تو حضور نے تین بار فرمایا تھا اللّٰھم اشھد اللہ اب اس بات پر تو گواہ رہیو، میں نے تیری بات تیرے بندوں تک پہنچا دی ہے تیرے سامنے میدانِ عرفات میں کھڑے ہو کر یہ خود اقرار کر رہے ہیں کہ اللہ کے نبی نے اللہ کی بات ہم تک پہنچا دی، تو جیسے حضور اللہ کی بات پہنچانے کے مکلف تھے اسی طرح دل کی اور باطن کی ان کیفیات کو بھی پہنچانے کے حضور مکلّف ہیں۔ اور یہ مناصب نبوت میں سے منصب ہے پیغمبر کا۔ یتلوا علیھم اٰیاتہٖ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ۔ اللہ جل جلالہٗ نے فرائض نبوت کی تقسیم اس طرح سے کی ہے کہ سب سے پہلا کام نبی کا یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق تک اللہ کی بات کو پہنچاتا ہے یتلوا علیھم اٰیاتہٖ اللہ کی آیات اُن پر تلاوت فرماتا ہے، اُنہیں آگاہ فرماتا ہے، اطلاع فرماتا ہے اُن کو کہ اللہ کریم کی طرف سے یہ بات نازل ہوئی ہے اب جو بیٹھ پھیر کر چلدیا اور اللہ کا کلام ہی اُس نے قبول نہ کیا تو محروم رہا۔ لیکن وہ شخص جو اللہ کی بات پیغمبر کی زبان حق ترجمان سے سُنکر رک جاتا ہے متوجہ ہوتا ہے سمجھنا چاہتا ہے تو سمجھاتا ہے اُسے کس طرح سے ہے ویزکیھم پہلے ان کے دلوں کو ان کے باطن کو ان کے ضمیر کو پاک کرتا ہے، تزکیہ کرتا ہے اُس کا اور جب تزکیہ ہوتا ہے تب جاکر تعلیم کتاب وحکمت ہوتی ہے۔ ویعلمھم الکتاب والحکمۃ پہلے دعوت الی اللہ ہے پھر تزکیہ ہے پھر معرفت باری ہے، تعلیم کتاب وحکمت کیا ہے اپنا عجز عیاں ہو جائے اور اللہ کی عظمت دل پہ جاگزیں ہو جائے انسان کو سمجھ آجائے کہ ہر طرح سے بڑائی اور ساری خوبیاں اس وحدہٗ لاشریک کے لئے ہیں اور میں ہر شعبۂ زندگی میں ہر فعل میں ہر بات میں ہر شے میں اس کی طرف محتاج ہوں وُہ ہے اور میں نہیں ہوں ؎

پناہ بلندی و پستی تُوئی
ہمہ نیستند آنچہ ہستی تُوئی

اس بات کو جان لینا ہی تعلیم ہے اور یہ تعلیم تزکیہ کے بعد آتی ہے تو تزکیہ تب ہوتا ہے۔ دنیا میں ہر وہ شے پاک ہوتی ہے جس پر اللہ کا نام لیا جائے جس سے اللہ کا نام مٹا دیا جائے

اس میں پاکی اور طہارت نہیں رہتی، اچھائی یا خوبی نہیں رہتی۔ آپ دیکھیں کہ حلال جانور جو شریعت نے ہمارے لئے کر دیئے ہیں جن کا کھانا ہم پر حلال ہے۔ اگر اُس کا دم بھی اللہ کے نام کے بغیر خارج ہو جائے تو وہ حرام ہو جاتا ہے اللہ کا نام لے کر اُسے ذبح کرو اُس پر بھی بسم اللہ اللہ اکبر کی چھری چلاؤ تب وہ طیب طاہر اور کھانے کے قابل بنتا ہے۔

پیر مہر علی شاہ گولڑوی کے فتوی کو میں دیکھ رہا تھا تو کسی نے جانوروں کے ذبح کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے اُسے ذبح کا طریقہ ارشاد فرمایا اور اہالیان محفل پاس بیٹھے تھے ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے۔ دیکھو جانور مکلف بشرع کا نہیں ہے تکلیف بشرعی نہیں ہے اس پر لیکن اگر اس کا دم بھی اللہ کے نام کے بغیر خارج ہو تو اسے حرام کر دیتا ہے۔ تو انسان جو مکلف ہے جب اس کی سانسیں اللہ کے نام کے بغیر خارج ہوں تو کیا ہوتا ہے جبکہ انسان مکلف ہے معرفت کو پانے کا۔ حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "جو دم غافل سو دم کافر" کہ جس سانس میں اللہ کا نام نہ آئے وہ کفر میں چلا گیا۔ یہ کیوں فرماتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو ذکر الٰہی کی عظمت سے آشنا ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال یہ تھا کہ جب حضورؐ نے دعوت الی اللہ دی تو جس کے منہ سے لبیک نکل گئی تو اس کا نہ صرف دل بلکہ اس کے وجود کا ایک ایک ذرہ ذاکر بن گیا حتی کہ اس شخص میں وہ قوت آ جاتی تھی وہ طاقت آ جاتی تھی جمال مصطفوی کو پا کر کہ جو اس کو دیکھ لیتا تھا اس کا وجود بھی ذاکر ہو جاتا تھا۔ حتی کہ ہمیں حدیث شریف میں ملتا ہے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے وہ فرماتے ہیں مدینہ منورہ میں ہم کھانا کھانے کے لئے اپنے سامنے چنتے تھے۔ اُس کھانے سے اللہ کا ذکر اور اللہ کی تسبیح سنتے تھے حتی کہ ہم اُسے کھا رہے ہوتے تھے، تو یہ کیوں اس میں سے بھی اللہ اللہ کی آواز آنے لگتی تھی۔ یہ پرتو جمال باری سیما ھم فی وجوھھم جو اُن کی پیشانیوں پر نقصاں تھے انوار۔ وہ اُسے بھی منور کر کے اُس مادے کو بھی ذاکر کر دیتے تھے اور وہ کھانا بھی اللہ اللہ، سبحان اللہ الحمد للہ کہنا شروع کر دیتا تو یہ سارے کا سارا کمال کس کا تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ اور یہ فیضان نبوی تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض نبوت میں سے یہ ایک فرض تھا حضورؐ مکلف تھے اس رحمت کو تقسیم کرنے کے اور حضورؐ نے اس کو یوں بانٹا یوں بانٹا کہ انسان تو انسان شجر و حجر بھی اس سے محروم نہ رہے، حدیث شریف میں ملتا ہے حضور فرماتے ہیں کہ میں مکے کے اُن پتھروں اور درختوں کو پہچانتا ہوں جب میں گزرتا تھا تو وہ کہا کرتے تھے السلام علیک یا رسول اللہ یعنی انسان تو انسان رہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دولت کو یوں لٹایا کہ شجر و حجر اس سے سیراب ہوتے چلے گئے بلکہ اللہ اگر چشم بصیرت دے تو عرب کے صحراؤں میں آج بھی وہ انوار نظر آتے ہیں۔ اور صاحب بصیرت ہر اُس راہ کو متعین کر سکتا ہے جہاں سے محمد رسول اللہ کبھی کسی زمانے میں گزرے ہوں۔ بلکہ جہاں آپ کا نقش پا ہے وہ زمین یوں نظر آتی ہے جس طرح آسمان پر چاند، آپ اس بات کو شاید نہ سمجھ سکیں ایک تاریخی حقیقت کا جائزہ لیں تو ایک عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے وجود اور ان کے قلوب اس قدر منور ہو گئے تھے کہ یہ تو تاریخ جانتی ہے کہ صحراؤں کے سینے اُن

ان کے سامنے سمٹ گئے اور پہاڑوں کی بلندیاں اُن کے قدموں میں جھک گئیں اور سمندر ان کے لئے پایاب ہو گئے اس سب کے ساتھ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس سرزمین پر کلمہ توحید کو صحابہ نے پہنچایا دنیا کے مختلف ممالک میں اسلام آیا بھی اور وہاں سے رخصت بھی ہوا۔ لوگ دین حق سے آشنا بھی ہوئے اور پھر چشم فلک نے یہ تماشا بھی دیکھا کہ وہاں کوئی اللہ کا نام لینے والا نہیں رہا۔ آپ ابھی اس تقسیم ملک کو دیکھ لیں، آپ دیکھیں گے کہ میلوں تک علاقے اللہ کے نام سے خالی ہو گئے۔ کوئی مسلمان نہ رہا جہاں مسجدیں تھیں جہاں نمازی تھے، جہاں اذانیں ہوتی تھیں جہاں تلاوت ہوتی تھی، جہاں ذکر ہوتا تھا جہاں محفلیں بھی تھیں۔ تو وہ علاقے کے علاقے اللہ کے نام سے خالی ہو گئے لوگ ہجرت کر کے یہاں چلے آئے یا اُن علاقوں کو چھوڑ کر دوسری طرف چلے گئے اور وہ مسجدیں کھنڈر بن رہی ہیں اور کوئی اللہ کا نام وہاں نہیں لیتا حالانکہ وہاں پہلے مسجدیں تھیں ذکر ہوتے تھے، تلاوتیں ہوتی تھیں سجدے ہوتے تھے تو اس طرح دنیا کے اس خطۂ زمین اس سینے پر مختلف جگہوں پر اللہ کا نام آیا بھی چلا بھی گیا۔ لیکن جہاں اسلام صحابہؓ نے پہنچایا جس شہر میں جس ملک میں تاریخ کو کھنگال کر دیکھ لیں وہاں سے کبھی اللہ کا نام مٹایا نہیں جا سکا۔ یہ وہ قوت ہے جو اُن کے وجود اور قلوب میں تھی، باطن میں تھی یہ تاثیر اس تزکیہ باطن کی تھی جو محمد رسول اللہ کی صحبت سے اُنہیں نصیب ہوا تھا۔ یہ وہ برکت ہے جو اُن کی نگاہوں میں تھی۔ جو صرف زمین میں نہیں بلکہ زمین کی تہوں میں اس طرح پیوست ہو گئی کہ کوئی ساری زمینیں کھود ڈالے اُس کی جڑ کو اکھیڑ نہیں سکتا۔ تو وہ یہ دولت تھی جو آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم فرمائی۔

اب آیئے اس طرف کہ اس دولت کا بانٹنا کیا صحابہ تک ہی محدود تھا یا اللہ کی مخلوق کو ابدالآباد اس دولت کی ضرورت ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مخلوق اس کی محتاج ہے تو میرے بھائی! جب تک دین ہے، جب تک قرآن ہے جب تک اسلام ہے تب تک اس تزکیہ کی ضرورت ہے اور وہ اس لئے کہ تعلیم کتاب و حکمت کا مدار اس پہ ہے تو جس پہ مدار ہے جو مدار علیہ ہے جب وہ نہیں رہے گا تو جس کا مدار ہے وہ کیسے رہے گا۔ آپ ایک مکان کی نچلی منزل نکال دیں تو کیسے توقع کرتے ہیں کہ اُس کی اوپر سو منزلیں کھڑی رہیں گی۔ کیسے ممکن ہے آپ ایک مکان کی بنیاد نکال کر کیسے یہ اُمید رکھتے ہیں کہ یہ مکان باقی رہے گا تو دین جو ہے اُس کی بنیاد نکال کر کیسے یہ اُمید رکھتے ہیں کہ یہ مکان باقی رہے گا تو دین کی بنیاد کیا ہے ویزکیہم و یعلمہم الکتاب والحکمۃ۔ تعلیم کتاب و حکمت دین ہے۔ تزکیہ اس کی بنیاد ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ان کا تزکیہ فرماتے ہیں اور پھر اُنہیں معرفت الٰہی کی دولت سے بہرہ ور کرتے ہیں۔ اور پھر انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم فرماتے ہیں۔ تو یہ کتاب و حکمت کی تعلیم کیا یہ دنیا میں رہے گی خداوند عالم نے اس کا ذمہ لیا ہے

ایک بنیادی اُصول آپ سمجھ لیں کہ گمراہ اور بے راہ رو طبقہ جب کبھی بھی جو کوئی طوفان اُٹھتا ہے اس کی پہلی ٹکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتی ہے لیکن چونکہ مسلمانوں کے ملک میں اسلام کے نام پر براہ راست حضور سے

ٹھکرا لی نہیں جاسکتی۔ کوئی شخص ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہوتا تو پھر یہ اس طرح سے کرتے ہیں کہ آپ کی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو کوئی یہ کہہ دیتا ہے کہ جی ذخیرہ احادیث محفوظ نہیں کوئی کہہ دیتا ہے جی تعامل صحابہ جو تھا وہ اس دور کے لئے تھا۔ اس دور کی ضروریات اور تھیں، حالات اور تھے، ذہن اور تھے، سوچ اور جیسی تھی۔ آج کل اور جیسا ہے، آج کل تو قرآن حکیم کا مقصد و مفہوم موجودہ زمانے کے مطابق مقرر کرنا ہوگا۔ تو یہ اس طرح کی ساری چالاکیاں یہ کیوں کی جاتی ہیں کہ تعلیمات نبوی کو بدل کر مسخ کرکے حضور کی اُمت سے دھوکہ کیا جائے۔ لیکن اس کا ایک سنہرہ اُصول ہے اللہ کریم نے بیان فرما دیا ہے انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون کہ اس قرآن کریم کو اس اپنی کتاب کو اس اپنے ذکر کو میں نے نازل فرمایا ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ دار میں ہوں۔ اس حفاظت الہیہ کا آپ یوں مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ ۱۴سو سال بیت گئے ہر طرح کا کفر اس بات پہ متحد ہے کہ قرآنی تعلیمات کو مسخ کر دے۔ مگر اس نے اپنی ہر کوشش میں منہ کی کھائی۔ یہی حال احادیث کا ہے۔ محدثین کرام نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی اس طرح سے جُدا کر دیا کہ دُنیا کا بڑے سے بڑا کذاب بھی ذخیرۂ احادیث میں جھوٹ اس طرح شامل نہ کر سکا۔ فقہاء و محدثین نے اس کی نشاندہی نہ کر دی ہو اور احادیث کی کتابیں اس پر گواہ ہیں آپ دیکھ لیں کیا دنیا میں آپ کو کوئی شخص ایسا ملتا ہے جس کی زندگی کا ہر شعبہ اس کے ماننے والوں کے پاس محفوظ ہو جس کا سونا جاگنا جس کے الفاظ کی تعداد موجود ہو کہ اس نے زندگی میں اتنے الفاظ اپنی زبانِ حق ترجمان سے ارشاد فرمائے جس کی غذا محفوظ ہو اتنے سیر گندم اتنے سیر چاول اتنی غذا حضور نے استعمال فرمائی تھی۔ اس قدر لباس استعمال فرمایا تھا پھر زندگی ہر ہر حرکت و سکون خواہ وہ ذاتی زندگی ہو یا باہر کی محفل کی یا نجی ہو ہر ہر شئے محفوظ ہے اور پھر جن سے روایت حدیث ہے ایک ایک شخص کے خاندانی حالات محفوظ ہیں وہ کہاں پیدا ہوا وہ کیسا تھا اس کا خاندان کیسا تھا وہ ذہین تھا یا غبی تھا۔ وہ صادق تھا یا جھوٹا تھا۔ وہ دانا تر تھا یا بے وقوف تھا حتیٰ کہ آپ حیران ہوں گے محدثین کرام نے اکثر صوفیاء سے بھی احادیث چھوڑ دی تھیں اور یہ اُصول بنا دیا تھا کہ صوفیوں سے حدیث قبول نہ کی جائیں۔ بھائی یہ تو سب سے سچے لوگ ہوتے ہیں ان سے آپ قبول کیوں نہیں کرتے فرماتے ہیں محدثین کرام کہ یہ اس قدر سچے ہوتے ہیں کہ یہ دوسروں کو بھی اپنے جیسا سچا سمجھ لیتے ہیں اور کوئی جھوٹا ان کے سامنے بیان کر دے تو یہ سچ سمجھتے ہوئے آگے بیان کر دیتے ہیں یہ بھولے بھالے لوگ ہیں ہم ان سے بھی حدیث نہ لیں گے۔ حتیٰ کہ ایک حدیث کو حاصل کرنے کے لئے امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ مدینہ سے چل کر مصر گئے کسی نے کہا مصر میں ایک شخص ہے اس کے پاس ایک حدیث ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تو آپ نے وہ پورا سفر اختیار فرمایا جب وہاں پہنچے تو وہ شخص زمیندار تھا اپنے باغ میں موجود تھا گھوڑا چھوٹ گیا تھا گھوڑے کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا تو اس طرح سے اس نے اپنا دامن پھیلایا ہوا تھا۔ اور

گھوڑے کو بلا رہا تھا۔ جب گھوڑا دامن کے پاس آیا تو اس نے گھوڑا پکڑ لیا اور دامن چھوڑ دیا دامن خالی تھا تو حضرت کی طرف متوجہ ہوا آپ کون ہیں کیسے تشریف لائے تو فرمایا میں تو بڑی مسافت کر کے آیا تھا مجھ سے کسی نے کہا تھا۔ کہ آپ کے پاس حضور کی ایک حدیث ہے وہ حدیث لینے آیا تھا۔ لیکن اب آپ سے نہیں لوں گا واپس جاتا ہوں۔ کہاں مدینہ منورہ ہے اور کہاں مصر ہے اور اس دور کا کٹھن سفر۔ تو کہنے لگا حضرت اتنی صعوبت اٹھا کر ہو آپ تشریف لائے۔ کیوں نہیں لیں گے فرمایا تو خالی دامن پہ جانور کو بہلا رہا تھا مجھے تو تجھ پہ اعتماد نہیں رہا تم نے جانور سے دھوکا کیا ہے کوئی مٹھی بھر اس میں دانے ہی ڈال لیتا تو جانور سے دھوکا نہ ہوتا وہ تو اس امید پہ آیا تھا کہ تیرے دامن میں خوراک ملے گی اس کو تو نے پکڑ لیا اور دامن چھوڑ دیا میں تم سے حضورؐ کی حدیث نہیں لوں گا خواہ تیرے پاس سچی ہوں خواہ تو مجھ سے سچی بات کہے لیکن میرے معیار کے مطابق تو قابل اعتماد نہیں۔ تو یہ احتیاط ان کے دلوں میں کس نے ڈالی اس نے جو تعلیمات دین کی حفاظت کا ذمہ دار ہے یہ حفاظت الٰہیہ کے کرشمے تھے جو سارے کے سارے دین کو محیط ہے۔ جب قرآن بھی اس کے احاطے میں ہے حدیث کو بھی یہ محیط ہے تو قرآن کو جاننے اور حدیث کو ماننے والے انسانی افراد ہوں گے یا فرشتے یقیناً انسان ہوں گے تو انسان کو تو کتاب تعلیم و حکمت ہو ہی تب سکتی ہے جب اُن کا تزکیہ ہو جائے قرآنی اسلوب ہے یزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ تو جب کتاب و حکمت کی حفاظت ہو گی تو یقیناً تزکیہ نفوس بھی حفاظت الٰہیہ کے سہارے آگے بڑھتا رہے گا۔ ابدالآباد اس دنیا میں ایسے نفوس قدسی ہوں گے جو انوارات و فیوضات محمدیہ کے امین ہوں گے تب جا کر وانا لہ لحافظون کا وعدہ پورا ہو گا تو جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فیوض و برکات جاری ہوئے کہ آپ کی تعلیمات نے چار دانگ عالم کو منور فرما دیا اسی طرح یہ منبع فیض قلب اطہر سے جاری ہوا کہ جہاں جہاں پہنچتا گیا ان سینوں کو منور کرتا گیا۔ اُن کا تزکیہ کرتا گیا انہیں طاہر و طیب کرتا ہوا منور کرتا ہوا تعلیم کتاب و حکمت کی دولت بانٹتا ہوا چلا گیا۔ اہلیت و استعداد سے اُن کے دامن کو بھرتا ہوا چلا گیا تو اگر کوئی اس دولت کو نہ پائے تو وہ اس دولت کو کبھی نہیں پا سکتا۔ اگر کسی کو ذکر قلبی نصیب نہ ہو تو وہ مسلمان ہو ہی نہیں سکتا اور آپ اس بات پہ حیران نہ ہوں کہ جہاں ہے اقراراً باللسان وہاں ساتھ ہی ہے وتصدیق بالقلب۔ اگر کوئی شخص زبان سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتا ہے تو اس کے دل کی تصدیق ضروری ہے ساتھ اگر اس کا دل تصدیق نہیں کرتا تو مسلمان نہیں منافق ہے تو اس درجہ میں گو یہ خفیف تر درجہ ہے لیکن اس کا دل ذاکر تو ہو گیا تا اس نے الوہیت باری اور رسالت محمدی کی تصدیق تو کر دی تو گویا مسلمان ہونا ہی جب ہے جب دل ذاکر ہو خواہ ایک لمحہ دل نے ذکر کیا۔ ایک آنِ واحد صرف تصدیق کر کے سو گیا لیکن تصدیق کا فعل تو دل نے کیا تو گویا ایمان لانے کے لئے بھی دل کا ذکر ضروری ہے اگر دل اللہ کو نہیں مانے گا محض زبان مانے گی تو ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل:: دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

منافق بن سکتا ہے مومن نہیں بن سکتا اور اس کی ایک لمحے کی تصدیق جب کفر سے نکال کر اسلام سے بہرہ ور کر دیتی ہے تو اگر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خواب غفلت سے بیدار ہو جائے اور ہر آن اور ہر کروٹ اللہ اللہ کہنا شروع کر دے تو پھر آپ دیکھیں کیا ہوتا ہے پھر اس پر کس قدر تجلیات باری مرتب ہوں اور کس قدر یہ رحمت باری مرتب ہوں اور کس قدر یہ رحمت باری کو پائے اور کس قدر اللہ کی معرفت کو حاصل کرے اس کا اندازہ آپ اس کی اس عبادت سے لگا لیں کہ ایک آن اس کا اللہ کہنا انسان کو کفر سے نکال کر اسلام میں پہنچا دیتا ہے۔ ایک لمحے کی بیداری اس کی صدیوں کا کفر دور کر دیتی ہے اور نور اسلام سے انسان کو منور کر دیتی ہے اس دولت کو بھی حفاظت الٰہیہ حاصل تھی۔ صحابہ کرام نے جو عظمت پائی وہ محض تعلیمات نبوی سے نہ پائی تعلیمات نبوی علیٰ صاحبہ صلوات والسلام تو وہی ہیں جو مجھ اور آپ تک پہنچیں تعلیمات، اقوال، اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو مجھ اور آپ تک بعینہٖ پہنچے ہیں بحمداللہ صحابہ کرام نے صحابیت کا شرف جو پایا وہ صحبت رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے پایا۔

جمال ہم نشین در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم
گلِ خوشبوئے در حمام روزے
رسید از دستِ محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری
کہ از بوئے دلاویزے تو مستم

بگفتا من گلے ناچیز بودم
ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال ہم نشین در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

مولانا سعدی فرماتے ہیں کہ میں حمام میں گیا تو خوشبو دار مٹی دی گئی مجھے یہ صابن وغیرہ ایجاد نہیں ہوئے تھے تو لوگ مٹی سے سر دھویا کرتے تھے نہایا کرتے تھے ہمارے علاقے میں آب بھی وہ مٹی پہاڑوں میں ملتی ہے عورتیں نکال کر لے جاتی ہیں اور سر دھوتی ہیں تو اس مٹی کو معطر کر کے حماموں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ آپ فرماتے ہیں

گلِ خوشبوئے در حمام روزے
رسید از دست محبوبے بہ دستم
مجھے کسی دوست نے وہ خوشبو دار مٹی دی حمام میں
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری
کہ از بوئے دلاویزے تو مستم
تو میں نے کہا کہ تو مٹی یا مشک عنبر ہے کہ تیری خوشبو نے مجھے دیوانہ بنا دیا۔
بگفتا من گلے ناچیز بودم

وہ کہنے لگی میں تو ایک بے قیمت سی مٹی ہوں کچھ بھی نہیں
ولیکن مدتے با گل نشستم۔ مجھے تو چند لمحے پھول کی ہم نشینی میسر آ گئی۔
جمال ہم نشین در من اثر کرد۔ وہ صحبت تو پھول کی تھی پھول کا جمال اس خوشبو مجھے سرایت کر گئی وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم۔ میں تو اپنی ذات میں مٹی کی مٹی

ہی تھی۔ تو جب پھول سے زمین معطر ہو جاتی ہے تو محمد رسول اللہ کی صحبت نے صحابہ کرامؓ کو کہاں تک پہنچا دیا وہ منزلت و عزت وہ قدر وہ دولت عطا کی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انہی کا حصہ بن کر رہ گئی اور حضور کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد کوئی بڑے سے بڑا شخص صحابی نہیں بن سکا۔ کوئی محنت میں ان سے بڑھ سکتا ہے، مجاہدے میں بڑھ سکتا ہے نوافل پڑھنے میں بڑھ سکتا ہے۔ تسبیحات میں بڑھ سکتا ہے، لیکن ان کے درجہ صحابیت کو نہیں پا سکتا۔ کیوں، جمال ہم نشین جو اُن کو نصیب ہوا ہے وہ بعد میں آنے والے کو نصیب نہیں تو پتہ چلا کہ تعلیمات نبوی تو بعد والوں کو بھی وہی ملیں لیکن جمال نبوی جو ان کے حصے میں آیا وہ دوسروں کو نہیں ملا۔ اور یہی اُن کی فضیلت کا مدار ہے یہی سبب ہے اُن کے صحابی بننے کا۔ تو میرے بھائی صحابیت کے لئے کیا اللہ جل شانہ نے انسانوں کی درجہ بندی کی تھی۔ کوئی طبقات مقرر کئے تھے انسانوں میں کہ اتنی جماعتیں پڑھا ہوا ہو تو صحابی بن سکتا ہے یا مرد ہو تو بن سکتا ہے عورت نہیں بن سکتی۔ یا جوان بن سکتا ہے بوڑھا نہیں بن سکتا۔ بچہ نہیں بن سکتا یا گورا بن سکتا ہے کالا نہیں بن سکتا، یا فلاں قوم کا بن سکتا ہے فلاں کا نہیں۔ کوئی تخصیص ہے جو بھی آئے اپنا سینہ چاک کر کے جمال مصطفےٰ سے بھرے وہ صحابی بن سکتا ہے تو یہ ولایت کی پابندیاں کیوں ہیں کہ فلاں نسل سے ہی ولی بن سکتا ہے اور فلاں قوم سے ہی ولی ہو سکتا ہے اور فلاں خاندان سے ہی ہو سکتا ہے ولایت تو صحابیت کی جوتی کی خاک بھی نہیں ہے۔ تو ولی ہونا ہر مسلمان جوان بچے بوڑھے کا حق ہے جب سب صحابی بن سکتے ہیں تو سب ولی کیوں نہیں بن سکتے جب ایک صحابی کی شان پر سارے جہان کے اولیا قربان کئے جا سکتے ہیں صحابیت پر کوئی پابندی نہیں تو یہ ولایت کیونکر بٹ کر رہ گئی آزاد میں قوموں میں اور بعض گھروں میں، ہر مسلمان کا حق ہے کہ انوارِ محمد رسول اللہ سے اپنے سینے کو منور کرے اور اللہ کے مقرب بندوں میں شامل ہو۔ مسلمان کی شان یہی ہے کہ وہ بات کرے تو اس کے منہ سے انوارات محمدیہ خارج ہوں وہ بات کرے تو اس کی بات دلوں پر تیر چلائے وہ نگاہ اُٹھائے تو دلوں کو شکار کرتا چلا جائے وہ جس طرف متوجہ ہو اس طرف کو تہہ تیغ کرتا چلا جائے، لوگوں کے رسومات مٹاتا چلا جائے اور معاشرے کی بدعات مٹاتا چلا جائے اور جس طرف جائے نقوش پائے محمد رسول اللہ کو پائندہ و تابندہ کرتا ہوا چلا جائے جس گلی سے گزر جائے وہاں لوگ شہادت دیتے رہیں کہ یہاں سے حضور کا کوئی چاہنے والا گزرا تھا۔ مسلمان کی تو شان ہی یہی ہے اگر ایسا نہیں ہے تو وہ ایک لٹے پٹے قافلے کا مسافر ہے جس کے اجداد کبھی بستے تھے جن کے پاس کبھی دولت تھی لیکن اُسے دشمنوں نے لوٹ لیا اُسے بے دست و پا کر دیا۔ وہ زخموں سے گھائل ہے وہ پیٹ سے بھوکا ہے وہ جیب سے خالی ہے اور تہی دست اللہ کی مخلوق کے سامنے بھیک مانگتا پھر رہا ہے پھر اس کا حال یہ ہے، دو تین سے ایک حال ضرور ہوگا یا وہ اپنے قافلے کی دولت کا امین ہوگا اور اُس سے وہ دولت لوٹی جا چکی ہوگی۔ تو آپ کیا پسند کرتے ہیں کہ ہماری قوم اور ہمارے افراد جو ہیں قوم کے یہ اُس لٹے پٹے قافلے کا ثبوت

مہیا کریں یا یہ ایک بستا ہوا گھرانہ ہو، ایک آباد گلشن ہو جس میں گلہائے رنگا رنگ عیاں ہوں اور جس میں جمال مصطفےٰ ہر طرف بکھرا ہوا ہو۔ ان کے اٹھنے بیٹھنے میں وہ انداز پایا جائے کہ انسان اندازہ لگا سکے کہ حضور کس طرح بیٹھتے تھے کس طرح اٹھتے تھے ان کے بات کرنے سے وہ اسلوب واضح ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نشانیاں ظاہر ہو رہی ہوں۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟ ان میں سے کونسی حالت ہمارے حق میں بہتر ہے یقیناً یہی کہ ہم وارث ہوں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ یہ ہماری محرومی اس لئے ہے ؎

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا۔

دولت تو لوٹ گئی، دولت تو کمائی جا سکتی ہے ہماری مصیبت یہ ہے کہ ؎

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ہم اس لوٹ پر اپنی محرومی پر مطمئن ہو گئے ہماری بدنصیبی تو یہ ہے کہ ہم اپنی اس محرومی پر خوش ہیں میرے بھائی جس طرح تعلیماتِ نبوی کو حفاظت الٰہیہ حاصل ہے اسی طرح فیوضاتِ نبوی کو جس فیضِ صحبت نے صحابہ کو صحابی بنایا اس کو بھی حفاظت الٰہیہ حاصل ہے اور جب تک زمین یہ سورج طلوع ہوتا ہے جب تک یہ شب و روز رواں دواں ہیں جب تک یہ زمین و آسمان قائم ہیں تب تک اسے حفاظت الٰہیہ حاصل رہے گی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت تب قائم ہو گی حتیٰ لا یقال اللہ اللہ کہ زمین پر کوئی ایک شخص بھی اللہ اللہ کہنے والا نہیں رہے گا جب یہ لوگ نہیں رہیں گے تو یہ جہاں نہیں رہے گا، یہ زمین نہیں ہو گی یہ آسمان نہیں ہو گا یہ سورج بے نور ہو جائے گا۔ یہ چاند جھڑ جائے گا یہ ستارے گر جائیں گے یہاں ہر شے ناپید ہو جائے گی۔ کل من علیھا فان کا منظر ہو گا۔ جب مسلمان تو نہیں ہو گا، تو کچھ بھی نہیں ہو گا تو یقین ہے اس گھر کا تو یا سی ہے اس کائنات کا تو امین ہے اس دولت کا جو انبیاء علیہم السلام لائے۔ جب تو اجڑے گا تو خدائی اجڑے گی جب تو اجڑے گا تو کائنات بکھرے گی جب تو برباد ہو گا تو یہ سارا نظام برباد ہو گا قیامت قائم ہو گی اور کوئی شے باقی نہ رہے گی تو کیا یقین کا یہ حق ہے کہ اپنے مکان کو اجاڑنے کا سبب بنے کیا تو سے یہ زیب دیتا ہے کہ ہمارے پاس کوئی جواب ہے اس بات کا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میدانِ حشر میں یہ سوال کر دیں کہ تو مدعی تو ہے میری امت میں ہونے کا لیکن میرے دین کی آبادی کے لئے تو نے کیا کیا۔ تو دین کی آبادی کا سبب بنا یا دین کی عمارت کو ڈھانے کا ذریعہ بنا۔ جب تیرے پاس میری یہ امانت پہنچی تو اس کا حال کیا ہوا۔

میں حدیث شریف پڑھ رہا تھا۔ اللہ اللہ اللہ میری نگاہ سے یہ حدیث شریف گزری کہ اگر کوئی از راہِ شفقت یتیم کے سر پر ہاتھ رکھے تو اسے اس قدر نیکیوں کا ثواب ملتا ہے جتنے بال اس کے ہاتھ کے نیچے آجائیں، تو معاً یہ جو خیال میرے دل میں آیا تھا کہ یا رسول اللہ اب تو اس کائنات میں اگر یتیم ہے تو آپ کا لایا ہوا دین اگر کوئی بے کس و بے بس نظر آتا ہے ہمیں تو مسلمانوں کے ملک میں مسلمانوں کا دین بے بس ہے بے کس ہے جسے کوئی نہیں پوچھتا۔ میونسپل کمیٹی اگر کوئی قانون بنا دے تو اسے کوئی نہیں توڑتا لیکن محمد رسول اللہ کے بنائے ہوئے قانون کی سرِ عام

بے حرمتی ہوتی ہے رمضان شریف میں ہوٹل چلتے ہیں ، سڑکوں پہ سگریٹ پئے جاتے ہیں سینما آباد ہوتے ہیں مسجدیں ویران ہوتی ہیں کوئی نہیں پوچھتا شہر کا کمزور سے کمزور انسان سگریٹ سلگا کر سڑک پہ رواں ہے اُسے کوئی روکنے والا نہیں ۔ تو کمزور تر اور اگر یتیم و بے بس ہیں نظر آتا ہے تو کیا یہ دین ہی نہیں تو آج اس کے سر کو کسی کے دستِ شفقت کی ضرورت ہے کیا یہ ہمارا حسنِ سلوک ہے دین کے ساتھ ۔ کیا ہم نے اس کی حفاظت کا حق ادا کیا ہے کیا یہ جو ہمارے لئے ڈھال ہے میدانِ حشر میں جو ہمارے اور دوزخ کے درمیان ایک آڑ ہے جو ہمارے اور اللہ کے غضب کے درمیان ایک دیوار ہے اس دیوار کو ڈھانے والا کون ہے ؟ کہیں ہمیں تو نہیں گرا رہے اس کو تو ہم کیوں نہیں گرائیں گے ، جب ہم اس کی عظمت سے ہی آشنا نہیں ۔ ایک شخص گنوار تھا ۔ اس نے باجرہ کی فصل بوئی زمیندار اکثر بنا لیا کرتے ہیں ایک جھونپڑی سی جب باجرے پہ دانے نکلتے ہیں تو بے شمار چڑیاں آجاتی ہیں کھانے کے لئے تو وہ ایک رسّی سی بٹ لیتے ہیں اس میں پتھر گھما گھما کر پھینکتے رہتے ہیں چڑیوں کو اُڑاتے رہتے ہیں اُسے کہیں سے خزینہ مل گیا جواہرات کا تو کہنے لگا یہ تو بڑے خوبصورت پتھر ہیں ان سے چڑیاں اُڑایا کروں گا ۔ ہیرے پھینک رہا ہے اور باجرے کی حفاظت کر رہا ہے ۔ نادانی میں یہی ہوتا ہے کہ ہم دین کو پھینک رہے ہیں اور دنیا کما رہے ہیں ہیرے پھینک کر ہم باجرے کی حفاظت اور رکھوالی کر رہے ہیں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پامال کر کے ایک وقت کا لقمہ حاصل کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں لیکن بھائی یہ خزانہ یوں ہی نہیں ہے کوئی اس کا مالک بھی ہے وہ ہم سے حساب بھی لے گا ہم سے ایک دن بات بھی ہو گی اور بھرے میدان میں ہو گی لوگ یہ دعویٰ لے کر بھاگیں گے میدانِ حشر میں "وجاءت کل نفس معھا سائق و شہید"

اُس کی حالت سے آگاہ اور اُسے کھینچ کر لانے والا سائق ہوتا ہے جیسے آپ کو جوان کہہ دیتے ہیں جو ہنٹر مار کر چلانے والا پھر مجھ جیسے گنہگار بھاگیں گے تو سبھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل کی طرف اور دعویٰ کریں گے کہ ہم مسلمان ہیں ہم حضور کے اُمتی ہیں ، ہمیں کہاں بھگائے پھرتے ہو ۔ ہم پہ یہ کیوں چابک برس رہے ہیں اور ہمیں کیوں فرشتے پیٹ رہے ہیں اُدھر کدھر کھینچے ہو ہم تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جاننے والے ہیں تو بہت بڑا مجمع ہو گا ساری انسانیت وہاں جمع ہو گی ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے قرآن کریم میں آتا ہے "رب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا" یا اللہ یہ وہ لوگ ہیں جو آج میری طرف دوڑتے ہیں لیکن جب یہ دنیا میں تھے تو انہوں نے تیری کتاب کو اپنے اعمال سے خارج کر دیا ۔ انہیں میری طرف نہ آنے دے یا اللہ مجھے یہ لوگ قبول نہیں ہیں یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے طرزِ حیات سے قرآن خارج ہو گیا جس کی ترویج کے لئے میں نے دندانِ مبارک شہید کرائے جس کی تبلیغ کے لئے میں نے زخم کھائے میں نے صحراؤں کے سینے چھانے میں نے ہجرتیں کیں اور میں نے تلواریں برداشت کیں ۔

رُخِ انور پر اور میں نے اپنے بہترین ساتھی نثار کر دیئے جس کی تبلیغ، ترویج اور حفاظت پر انہوں نے مسلمانی کا دعویٰ رکھتے ہوئے اسی قرآن کو اپنی زندگی کے ٹائم ٹیبل سے خارج کر دیا اتخذوا ھذا القرآن مھجورا قرآن سے مفارقت اور جدائی اختیار کرلی انہوں نے ان کے اُٹھنے بیٹھنے کھانے پینے کمانے خرچ کرنے دوستی دشمنی کے ڈھنگ وہ نہیں تھے جو تیرا قرآن کہتا ہے اللہ انہیں میرے قریب نہ آنے دے۔

آج تو خلافِ سُنت فعل کرنا شاید اتنا مشکل نظر نہ آئے لیکن جب اس کا نتیجہ سامنے آئے گا تو بڑی مشکل ہوگی بڑی مصیبت ہوگی۔ دین کا تو اللہ حافظ ہے اور دین رہے گا یہ جو ہمارے ذہن میں وہم ہے کہ ہم نے اس کی حفاظت کی ہے۔

بات یہ نہیں ہے جیسا کہ میں پہلے عرض کر آیا ہوں قرآن بھی قائم رہے گا، حدیث نبوی بھی ہوگی سنت نبوی بھی ہوگی اور اس کو ماننے والے بھی ہوں گے اور وہ بھی ہوں گے جن کے قلوب اور سینے منور ہیں یہ سب کچھ رہے گا اگر ہم ان سے کٹ گئے تو ہم نہیں رہیں گے یہ محفل رہے گی اس کا اللہ حافظ ہے۔ لیکن ؎

بیٹھنے کون دے ہے پھر اس کو
جو تیرے آستاں سے اُٹھتا ہے

جو یہاں سے اُٹھ گیا جو اس محفل سے اُٹھ گیا اُسے اللہ کی کائنات میں کوئی جگہ بیٹھنے کی میسر نہیں آئیگی ہم یہ نہ سمجھیں کہ دین کوئی بوجھ ہے جو ہم نے اتار پھینکا ہے بلکہ ہماری اپنی بقا اسی کے ساتھ وابستہ ہے زندگی اسکے ساتھ وابستہ ہے ہمارا جینا اس پر موقوف ہے وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

## حرام چیز کو بطور دوا استعمال کرنے کے لئے چند شرائط

۱۔ ● حالت اضطرار کی ہو، خطرہ جان جانے کا ہو۔ معمولی تکلیف یا بیماری کا یہ حکم نہیں۔

۲۔ ● بجز حرام چیز کے اور کوئی چیز علاج کے لئے مؤثر نہ ہو یا موجود نہ ہو جیسے شدید بھوک کی حالت میں استثنا اسی وقت ہے جبکہ کوئی دوسری حلال غذا موجود نہ ہو۔

۳۔ ● اس حرام چیز کے استعمال کرنے سے جان بچ جانا یقینی ہو جیسے بھوک سے مضطر کے لئے ایک دو لقمہ حرام گوشت کا کھا لینا عادۃً اس کی جان بچانے کا یقینی سامان ہے۔
اگر کوئی ایسی دوا ہے جس کا استعمال مفید تو معلوم ہوتا ہے مگر اس سے شفا یقینی نہیں تو اس حرام دوا کا استعمال جائز نہیں ہوگا۔

۴۔ ● اس کے استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو۔

۵۔ ● قدرِ ضرورت سے زائد استعمال نہ کرے۔

(معارف)

# ایک خواب کی تعبیر

محمد حبیب الرحمان
ریٹائرڈ ایس پی

مارچ ۱۹۷۳ء میں، میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک غیبی آواز میں مجھے کہا جا رہا ہے "پندرھواں پارہ، پندرھواں رکوع" مجھے اپنی بے علمی کے باعث اس خواب کی کوئی صحیح تعبیر سمجھ میں نہ آئی۔ البتہ ہر جمعہ کو سورۃ کہف کی تلاوت کرنا میرے معمول میں داخل تھا۔ سورۃ بنی اسرائیل کے بارہ رکوع ہیں اور پندرھویں پارے کا پندرھواں رکوع سورۃ کہف کا تیسرا رکوع ہے۔ چنانچہ یہ بات تو سمجھ میں ضرور آئی کہ یہ خواب اصحاب کہف کے قصہ سے متعلق ہے لیکن اس میں میرے لئے ہدایت و رہنمائی کا کیا اشارہ ہے۔ یہ بات واضح نہ ہو سکی۔ چنانچہ میں نے اپنا یہ خواب استاذ المکرم یعنی اپنے مرشد مدظلہ العالیہ کی خدمت میں لکھ بھیجا۔ پیشتر اس کے کہ میں استاد مکرم کی تعبیر اور وضاحت بیان کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب کہف کا قصہ کچھ اجمالاً بیان کر دوں تاکہ اس پس منظر میں اعلیٰ حضرت استاد مکرم کے ارشاداتِ عالی کا صحیح مفہوم واضح ہو سکے۔

کہتے ہیں کہ چند نوجوان روم کے ایک ظالم بادشاہ دقیانوس کے زمانے میں تھے۔ بادشاہ جبراً بت پرستی کی اشاعت کرتا تھا چنانچہ عام لوگ تکلیف کے خوف سے اور کچھ طمع دنیوی سے اپنے سچے مذہب کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار کرنے لگے۔ ان حالات میں چند نوجوانوں کو جن کی تعداد ایک روایت کے مطابق سات تھی یہ خیال آیا کہ مخلوق کی خاطر خالق کو ناراض کرنا درست نہیں ان کے دل خشیت الٰہی اور نورِ تقویٰ سے معمور تھے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے بادشاہ کے روبرو جا کر یہ نعرۂ مستانہ لگایا کہ ہمارا رب تو وہی ہے جس نے آسمان اور زمین بنائے اور ہم اس کے سوا کسی کو اپنا معبود نہ پکاریں گے"۔ اس ایمانی جرأت و استقلال پر دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ بادشاہ کو ان کی جوانی پر رحم آگیا اور چند روز کی مہلت دیدی کہ وہ اپنے رویہ پر نظر ثانی کر لیں لیکن ان نوجوانوں کے پائے استقلال میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ بہر حال خطرہ کے پیش نظر وہ شہر کے قریب ایک پہاڑی غار میں روپوش ہو گئے اور بارگاہِ الٰہی میں دعاء کی کہ اے ہمارے پروردگار تو اپنی خصوصی رحمت سے ہمارا کام بنا دے حق تعالیٰ نے ان سب پر نیند طاری فرما دی۔ کہا جاتا ہے کہ سرکاری آدمیوں نے بہت تلاش کیا لیکن وہ پتہ نہ لگا سکے۔ بادشاہ کے مشورہ سے ایک

ایک کسیہ کی تختی پر ان نوجوانوں کے نام لکھوا کر خزانہ میں رکھ دیئے تاکہ کسی آئندہ زمانہ میں اُن نوجوانوں کا سُراغ لگ جائے تو صحیح حالات آشکارا ہو سکیں کہا جاتا ہے کہ وہ تین سو نو سال تک سوتے رہے، پھر اللہ تعالےٰ نے اُن کو جگا دیا لیکن خود اُن کو بھی پتہ نہ لگ سکا کہ کتنا عرصہ سوتے رہے۔ اُن میں سے ایک نوجوان شہر گیا تاکہ کچھ کھانے کو خرید کر لائے اور حالات کا بھی پتہ لگائے۔ اس طرح یہ راز لوگوں کو معلوم ہو گیا۔

دراصل اس زمانہ میں "بعث بعد الموت" کا مسئلہ زیر بحث تھا حق تعالےٰ نے اس واقعہ سے اس مسئلہ کو حل فرما دیا جس سے آخرت پر یقین کرنا آسان ہو گیا اور حقیقت سے بھی پردہ اُٹھ گیا اور اب کسی اختلاف کی گنجائش باقی نہ رہی۔

استاد مکرم نے اپنے خصوصی انداز میں میرے خواب کی تعبیر میں اس طرح وضاحت فرمائی۔

"عزیزم! یہ رکوع اصحاب کہف کے قصہ سے لبریز ہے۔ اور ان کے کمالات و کرامات سے بھرپور ہے۔ قرآن کے اس رکوع میں تو صاف صاف بیان ہے کہ خدائے تعالےٰ اس وقت ملتا ہے اور انسان، کامل انسان و مقرب خدا و صاحب کرامات اس وقت بنتا ہے جب تمام تعلقات دُنیا و مخلوق دُنیا سے توڑ ڈالے، سو اُس وقت رب العالمین اپنے بندے کو خود اپنی حفاظت میں لے کر اس کی پرورش و زندگی خرقِ عادت بنا دیتا ہے اور بغیر خورد و نوش اور بول و براز کے زندہ رکھتا ہے اور رکھ سکتا ہے اور ہر طرح کے آرام و آسائش میں محفوظ رکھتا ہے پھر ان کے وجود میں وہ رُعب و ہیبت ڈال رکھی تھی کہ اشرف الخلق اور خلاصۂ مخلوق رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی و امی کو بھی خطاب فرمایا اور ان الفاظ میں خطاب فرمایا۔

"لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا"

یعنی اے میرے رسول ان میرے خاص بندوں کو جو اولیاء اللہ ہیں جھانک کر دیکھیں تو بھاگ اُٹھیں گے اور رُعب سے بھر جائیں گے۔

ان آیات سے تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ثابت ہوتی ہے، جب آپؐ نے ان کو (یعنی اصحاب کہف کو) دیکھا نہیں، آپؐ تاریخ دان نہیں، اُن کے زمانے کے نہیں تو پھر ان کی (اصحاب کہف کی) خبر کس طرح بیان کی آپ خدا کے رسولؐ ہیں آپؐ نے خدا سے خبر پا کر بتائی۔

عزیزم! معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یقیناً اشارہ کیا گیا ان کی حیات کی طرف۔ عزیزم ہمارا تعلق خدا تعالےٰ سے اس کی خاص عبادت کا ہے اور مال و اولاد سے تعلق محض حفاظت کا تاکہ یہ ضائع نہ ہو جائیں۔ یاد رکھنا ابتداء بندہ کی طرف سے ہوتی ہے (جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ) جو میری طرف چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔

عزیزم! محبت اور قرب خداوندی بلکہ تمام کمالات حتیٰ کہ قطب، ابدال، اوتاد، نجباء، نقباء، غوث، قیوم

افراد، قطب، وحدت، وصداقت یہ تمام ہی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کی خاک سے ملتے ہیں، محبت وقرب خداوندی کی بڑی علامت ونشانی خدائے تعالیٰ نے قرآن میں اتباع نبوت بتائی ہے۔

فاتبعونی یحببکم اللہ

ہر عمل کا ثمرہ برزخ وآخرت میں ملتا ہے میں نے برزخ پر پوری نگاہ ڈالی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہترین عمل برزخ میں علمِ سلوک کو پایا۔

عزیزم! منازل سلوک وعلم تصوف کا مدار دو چیزوں پر ہے۔ اوّل اتباعِ شریعت محمدی وسنت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم، دوم خلوص باشیخ جس وقت یہ چیز پوری حاصل ہوجائے تو روئے زمین کی حکومت جوتی کے مساوی بھی نہیں ہوتی۔

جب اللہ ہی مل جائے تو باقی کس کی ضرورت ہے آپ اتباع شریعت کی کوشش کریں۔
دوم محنت لطائف پر کریں۔

# پانچ مہلک قومی امراض

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے ایک مرتبہ خطبہ دیا جس میں فرمایا:۔
اے گروہ مہاجرین! پانچ خصلتیں ہیں جن کے متعلق میں اللہ تعالےٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ تمہارے اندر پیدا ہوجائیں۔

اوّل:۔ یہ کہ جب کسی قوم میں بے حیائی پھیلتی ہے تو ان پر طاعون اور وبائیں اور ایسے نئے نئے امراض مسلّط کردئے جاتے ہیں جو ان کے آباؤ اجداد نے سنے بھی نہ تھے۔

دوم:۔ یہ کہ جب کسی قوم میں ناپ تول کے اندر کمی کرنے کا مرض پیدا ہوجائے تو ان پر قحط اور گرانی مشقت اور حکام کے مظالم مسلط کردئے جاتے ہیں۔

سوم:۔ یہ کہ جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا نہ کرے تو بارش روک دی جاتی ہے۔

چہارم:۔ یہ کہ جب کوئی قوم اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول کے عہد کو توڑ ڈالے تو اللہ تعالےٰ ان پر اجنبی دشمن مسلط فرادیتے ہیں جو ان کے مال ناحق چھین لیتا ہے۔

پنجم:۔ یہ کہ جب کسی قوم کے ارباب اقتدار کتاب اللہ کے قانون پر فیصلہ کرائیں اور اللہ تعالےٰ کے نازل کردہ احکام ان کے دل کو نہ لگیں تو اللہ تعالےٰ ان کے آپس میں منافرت اور لڑائی جھگڑے ڈال دیتے ہیں۔

(ابن ماجہ و بیہقی)

# رمضان المبارک

## اخلاقی تربیت، امتحان اور انعاماتِ الٰہی کا موسم

حافظ عبدالرزاق ایم۔اے عربی

انسان اس دنیا میں قدم رکھنے کے بعد ہوش سنبھالتے ہی جینے کا ڈھنگ سیکھنا شروع کر دیتا ہے اور یہ عمل اتنا طویل ہے کہ اس دنیا سے رخصت ہونے تک جاری رہتا ہے۔

اس عمل میں تین چیزیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

اول زندگی کا نصاب یا آئیڈیل۔ دوئم معلم سوئم ماحول۔ ہر انسان اپنی پسند کے مطابق کسی خاص قسم کی زندگی بسر کرنے کو اپنا آئیڈیل بنا لیتا ہے۔ اور اسی کے مطابق ایسے اُستاد کو تلاش کر لیتا ہے جو اسے اُس کے مطلوبہ نقشہ کے مطابق زندگی بسر کرنے کا طور طریقہ سکھائیں۔ پھر وہ ایسے ماحول کی تلاش شروع کر دیتا ہے جہاں وہ آزادی سے اپنے مطلوبہ نقشہ کے مطابق زندگی گزار سکے اور وہ ماحول اس کے لئے سازگار ثابت ہو شریفانہ اور بہیمانہ دونوں قسم کی زندگیوں میں یہی اصول کار فرما نظر آتا ہے مثال کے طور پر ایک شخص ڈاکٹر بننا چاہتا ہے اسے یقیناً میڈیکل سائنس سے دلچسپی ہوگی پھر وہ ایسے اساتذہ تلاش کرے گا جو فن طب کے علمی اور عملی دونوں پہلوؤں میں اس کی رہنمائی کر سکیں۔ پھر وہ ایسے ماحول کے لئے میڈیکل کالج میں داخلہ لے گا۔ اس کی علمی اور نجی گفتگوئیں ایسے ہی لوگوں سے ہوں گی جو فنِ طب کے ساتھ دلچسپی رکھتے ہوں گو دنیا میں اور بھی بے شمار شریفانہ فن اور ان کے جاننے والے لوگ موجود ہیں مگر اسے جو لطف اور سکون اپنے فن کے جاننے والوں میں آئے گا وہ کسی اور جگہ نہیں مل سکے گا۔

اسی طرح ایک شخص چور اور ڈاکو بننا پسند کرتا ہے وہ اسی قسم کے ناول تلاش کرے گا ایسی فلمیں دیکھنے کا شوق ہوگا اور اسی قماش کے لوگوں کے ساتھ ملنا جُلنا اُٹھنا بیٹھنا پسند کرے گا۔ اور اسے ایسے جرائم پیشہ لوگوں کے ماحول میں وہ نشہ آئے گا جس کا ایک شریف آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر، انجینئر، قانون دان، تاجر صنعت کار بننا اچھی بات ہے۔ اور لوگ اپنی اپنی پسند کے مطابق کسی نہ کسی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی طرح چور، ڈاکو، قاتل، سمگلر وغیرہ بننا بُری بات ہے۔ مگر پھر بھی لوگ ان ننگ انسانیت

پیشوں میں عمریں کھپا دیتے ہیں۔

اصل ضروری اور بنیادی چیز تو انسان بننا ہے اور انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ سیکھنا ہے مگر بہت کم لوگ اس انداز سے سوچنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انسانیت بہت بڑا شرف ہے، بڑی عظمت اور بلندی ہے اور ظاہر ہے کہ بلندیوں تک پہنچنے کے لئے محنت اور مجاہدہ کرنا پڑتا ہے اور فانی اور وقتی لذتوں کے رسیا محنت سے جی چراتے ہیں اور حیوانیت کی پستیوں کی طرف لڑھکتے چلے جانے میں ہی مگن رہتے ہیں کسی بلند و بالا مکان کی چھت پر چڑھنے کے لئے وقت، کوشش اور ہمت درکار ہے اگر چھت سے نیچے آنا اور فوری طور پر آنا مطلوب ہو تو بس منڈیر پر بیٹھ کر جسم ذرا ڈھیلا چھوڑ دو تو ایک سیکنڈ میں نیچے پہنچ جاؤ گے۔ یہ اور بات ہے کہ جسم کی کوئی ہڈی پسلی نہ بچے یا جان ہی ہوا ہو جائے۔

خالق انسان نے انسان کو انسانوں کی طرح جینے کے لئے نصاب خود تجویز فرمایا ہے نہیں بلکہ تیار فرمایا ہے اور اس نصاب کی تعلیم دینے کے لئے اساتذہ کا انتخاب بھی خود فرمایا ہے۔ پھر ان اساتذہ کرام نے اپنی محنت شاقہ سے انسانوں کو ایسا انسانیت پرور ماحول تیار کر کے دیا جس کی نظیر انسانیت کی تاریخ میں اور کہیں نہیں ملتی۔ خالق انسان نے یہ سلسلہ ابتدائے آفرینش سے شروع کر دیا تا آنکہ اس نصاب انسانیت کی آخری کتاب اور اس کتاب کا آخری معلم مبعوث فرما کر اعلان کر دیا:۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔ اس نصاب کا نام اسلام اور قرآن کا نام قرآن حکیم اور اس آخری معلم کا نام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کے احسان سے انسانیت قیامت تک سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

اسلام نے انسان کی تربیت کے لئے ایک خاص طرز کے مجاہدہ کا نصاب مقرر کیا ہے جس کا اصطلاحی نام عبادات منصوصہ ہیں۔ ان عبادات میں سال بھر میں رمضان کے مہینے میں روزہ رکھنا بھی شامل ہے۔

## روزہ اور اخلاقی تربیت:۔

اسلام کی ہر عبادت کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہے مثلاً نماز میں طہارت، پابندی وقت، اطاعت امیر کے ظاہری آداب کے ساتھ اخلاص، خشوع، خضوع اور توجہ الی اللہ کے اوصاف پیدا کرنے اور حب زر، خود غرضی وغیرہ رذائل کا ازالہ کرنے کی مشق ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ تعلق باللہ اس انداز سے پیدا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اپنے کمائے ہوئے مال کا مالک نہیں بلکہ اللہ کے دیئے ہوئے مال کا امین سمجھنے لگتا ہے لہٰذا اس کے پیش نظر صرف مالک کی رضا ہوتی ہے۔

اسی طرح روزہ کا اپنا ایک خاص مزاج ہے جس کی نشان دہی نبی کریم نے ان الفاظ میں فرمائی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے الصوم لی وانا اجزی بہ۔ یعنی روزہ صرف میرے لئے ہے اور اس کا بدلہ میں ہوں میری خوشنودی ہے۔

ہر عبادت کی تہ میں ایک جذبۂ عبودیت ہوتا ہے مگر کوئی خاص ہیئت یا طرز ادا اس عبادت کی مرئی صورت ہوتی ہے جو سر کی آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ نماز ہے کہ آدمی وضو کرتا ہے، قیام، رکوع، سجدہ اس عبادت کے مظاہر ہیں دیکھنے والے کہتے ہیں کہ یہ آدمی نماز پڑھ رہا ہے اسی طرح زکوٰۃ میں لینے والا یہ جان لیتا ہے کہ یہ شخص مالی قربانی کر رہا ہے، حج میں گھر بار چھوڑ کر جانا تو ظاہر ہر ہے اب تو خاص اہتمام سے ہار پہنائے جاتے ہیں، جلوس نکالے جاتے ہیں کہ صاحب حج پر جا رہے ہیں اور یا حج سے آ رہے ہیں غرض ہر عبادت کے عمل سے اس خاص عبادت کا ظاہر ہونا ایک قدرتی بات ہے مگر روزہ ایسی عبادت ہے۔ بندے اور رب کے سوا کوئی تیسرا شخص اس سے واقف نہیں ہو سکتا۔ اس لئے روزہ کی خصوصیت یہ ہے کہ آدمی میں یہ جذبہ بیدار کرتا اور اسے ترقی دیتا ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے، جانتا ہے۔ لہٰذا اس سے معاملہ کھرا رکھنا چاہیئے۔ یہ ایک وصف حقیقت میں انسانیت کی معراج ہے۔ انسان جو کام کرتا ہے اس سے یا وہ اچھا ہوگا یا برا۔ اگر اچھا کام ہو تو آدمی کے دل میں خواہ مخواہ یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ لوگ اس سے آگاہ ہوں اور میری تعریف کریں۔ یہی ریا ہے اور یہی انسان کا عمل صالح کو ضائع کر دیتی ہے۔ اور اگر وہ کام برا ہے تو آدمی یہ احتیاط کرتا ہے کہ کوئی عام شخص یا قانون کا کوئی محافظ دیکھ تو نہیں رہا۔ اگر اسے اطمینان ہو جائے کہ اسے کوئی نہیں دیکھ رہا تو وہ کر گزرتا ہے۔ یہی مجرمانہ ذہنیت ہے۔ اور اس کا ضمیر مجرم ہے خواہ وہ بظاہر بڑا پارسا شمار ہوتا ہو۔

روزے کی خاصیت یہ ہے کہ انسان میں یہ عقیدہ پختہ کر دیتا ہے کہ میرے عمل سے میرا رب آگاہ ہے اور اس کا صلہ مجھے وہ دے گا کسی کو بتانے اور دکھانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ پھر روزہ انسان میں یہ عقیدہ پختہ کر دیتا ہے کہ ایک خفیہ پولیس ہر وقت اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں اس لئے کیوں نہ بھلے مانسوں کی طرح آدمی بن کر زندگی بسر کی جائے۔ پھر روزہ انسان کو یہ تربیت دیتا ہے کہ اللہ کی نافرمانی کرنے سے اس کی گرفت سے نہ تو کوئی بچ سکتا ہے، نہ کوئی دوسرا اُسے بچا سکتا ہے اس کے برعکس انسانی مواخذہ سے خواہ وہ سوسائٹی کی طرف سے ہو یا قانون اور حکومت کی طرف سے آدمی بچ نکلنے کی کوئی نہ کوئی تدبیر تلاش کر لیتا ہے۔

روزہ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسان کی خواہشات پر قابو پانے کا مطالبہ ہے۔ اور قابو پانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اتنی ہمت پیدا کرے کہ کونسی خواہش کس وقت کس حد تک پوری کر لینا معیوب نہیں بلکہ اس کی اجازت ہے۔ انسان کی سب سے زیادہ غالب خواہش غذا اور جنس کی ہے، غذا سے بقائے حیات اور جنس سے بقائے نوع مقصود ہے اگر اس خواہش کو سرے سے مٹا دیا جائے تو حیات اور نوع دونوں کا خاتمہ ہے لہٰذا روزہ اس خواہش پر کنٹرول کرنا سکھاتا ہے کہ ایک خاص وقت کے لئے یعنی طلوع فجر سے غروب آفتاب تک ضبط کیا جائے۔

اس ضبط کا فائدہ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی خواہشات کے ماتحت نہیں ہوگا بلکہ خواہشات اس کے ماتحت ہوں گی اور وہ اپنی خواہشات کا رُخ جس طرف موڑنا چاہے موڑ سکے گا اور خواہشات کا صحیح رُخ خود معلم انسانیتؐ نے بتادیا کہ لا یؤمن احدکم حتی تکون ھواہ تبعا لما جئت بہ یعنی کمال ایمان یہ ہے کہ آدمی کی خواہشات میری تعلیمات کے تابع ہوجائیں ۔

روزے کا یہ پہلو کہ خواہشات پر ضبط کرنا سکھاتا ہے، اتنا اہم ہے کہ اس کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے پوری انسانی تاریخ ایک کھلی کتاب ہے۔ انسان کی بے چینی، بدامنی، فتنہ و فساد کی واحد وجہ ہر زمانے میں یہ خواہش کی غلامی ہی رہی ہے۔ انفرادی حیثیت سے دیکھئے تو یہ چور، ڈاکو، قاتل، غنڈے، معاشرے کے امن کو غارت کرنے کا سبب کیوں بنتے ہیں بس یہی خواہش کی غلامی ہے۔ اجتماعی حیثیت سے دیکھئے تو اقوامِ عالم کو جنگوں میں جھونکنے کا سبب یہ ہوسِ اقتدار، حبِ جاہ اور حُبِّ مال ہی تو ہے۔

تو یوں سمجھئے کہ روزہ انسانیت کی انفرادی اور اجتماعی امن کی ضمانت ہے۔ اس سے یہ واضح ہوگیا کہ اسلام نے یہ مہینہ انسانیت کے معراج اور کمال تک پہنچنے کے لئے تربیت حاصل کرنے کا موسم مقرر کیا ہے۔

تربیت کا عمل صبر و تحمل کا کام ہے بعض وہ پابندیاں قبول کرنا پڑتی ہیں جن کا انسان عادی نہیں ہوتا۔ کچھ محنت اور مجاہدہ کرنا پڑتا ہے جو آرام پسند طبیعت کو دشوار گزرتا ہے۔ مگر اعلیٰ مقاصد کے لیے یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے کیونکہ اس کا صلہ پانے کی جو صورت ذہن میں ہوتی ہے وہ کچھ ایسی پرکشش ہوتی ہے کہ تکلیف کا احساس نہیں رہتا۔ دیکھئے فوج میں بھرتی ہوتے ہی سپاہی کو جو تربیت دی جاتی ہے کتنی دشوار ہوتی ہے P.M.A میں آرمی افسروں کو جو تربیت دی جاتی ہے وہ اس سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے۔ گوریلوں کو جو محنت کرنا پڑتی ہے ایک عام آدمی تو اس کا بیان سننے کی تاب نہیں لا سکتا خصوصاً ان کا جو (SURVIVAL) ٹسٹ ہوتا ہے اس کی تفصیل سنکر تو جسم کانپ کانپ جاتا ہے۔ اگر کوئی سپاہی، افسر یا گوریلا یہ شکایت نہیں کرتا کہ بھوکوں مار دیا یا رت جگے دے کر ہلکان کر دیا۔ اسی طرح بیماری کے علاج کی صورت ہوتی ہے۔ شوگر کے مریض کو ڈاکٹر کہتا ہے عمر بھر شکر استعمال نہیں کرنی یا گندم کی روٹی ہرگز چکھنی بھی نہیں چنے کا آٹا لو اور اسی کی روٹی کھاؤ۔ کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ ڈاکٹر نے ظلم کیا ہے اُلٹا ڈاکٹر کے ممنون ہوتے ہیں کہ صحت کی تدبیر بتادی خواہ کتنے مرغوبات کی قربانی کرنی پڑے۔ مگر ڈاکٹر کو دعا ہی دیں گے۔

روزے کی اخلاقی اور روحانی تربیت کا معاملہ مختلف نظر آتا ہے۔ لوگ لا الٰہ الا اللہ بھی پڑھتے ہیں اور اللہ پر اتنا اعتماد نہیں کہ اس کی معمولی سی پابندیاں بھی قبول کریں چنانچہ شکوہ ہوتا ہے کہ روزہ رکھنے سے کمزوری ہوجاتی ہے، طاقت کم ہوجاتی ہے رات کو دیر تک جاگنے سے صحت پر بُرا اثر پڑتا ہے وغیرہ۔ اللہ سے اعتماد ہٹ کر آدمی اگر عقلِ عامہ سے کام لے

تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انسان مرکب ہے جسم اور روح سے۔ جسم کی تخلیق مٹی سے ہوئی اور روح عالم امر کی شے ہے۔ لہٰذا دونوں کے تقاضے جدا مرغوبات مختلف، حیثیت الگ۔ اصل انسان روح ہے بدن اس کا آلہ کار یا سواری ہے۔ بدن کا تقاضا مادی لذتوں کا حصول نفسانی خواہشات کی تکمیل ہے۔ اور روح کا تقاضا ابدی راحتوں کی فکر اور اس کی تدابیر اختیار کرنا اور خواہشات پر قابو پا کر انہیں ایک شرعی ضابطے کے تحت لانا۔ ظاہر ہے کہ بدن کے تقاضے پورے کئے جائیں گے تو وہی توانا اور طاقت ور ہوگا اور فربہ ہوگا مگر اس کا اثر یہ ہوگا کہ روح دب کر لاغر کمزور اور بیمار ہو جائے گی۔ اور اگر روح کے تقاضے پورے کرنے کا اہتمام کیا جائے گا تو بدن میں فربہی نہیں آسکتی مگر اس کی قوت میں کمی کی جگہ اضافہ ہی ہوگا۔ اس حقیقت کی شہادت کے لئے تاریخ کے صفحات کھلے ہیں کفر و اسلام کا پہلا تصادم اسی رمضان کے مہینے میں بدر کے میدان میں ہوا۔ "رمضان زدہ" دبلے پتلے جسموں والے ۳۱۳ تھے وسائل کا یہ عالم کہ ۷۰ گھوڑے اور ستر اونٹ تھے۔ رسد نہ ہونے کے برابر اور فربہ جسم والے کھاتے پیتے رمضان کی مار سے بچ جانے والے ۱۰۰۰ جن میں سے ۶۰۰ زرہ پوش اور جن کے پاس ۷۰۰ اونٹ اور ۷۰۰ گھوڑے تھے، اسلحہ اور رسد کا سامان وافر تھا مگر نتیجہ کیا نکلا۔ کیا وہ لوگ ہار گئے جن کو رمضان کے روزوں نے کمزور اور لاغر کر دیا تھا اور وہ لوگ جیت گئے جو کھا کھا کے مشٹنڈے بنے ہوئے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ نتیجہ اس کے الٹ نکلا مگر کیوں؟ اس لئے کہ رمضان کے روزوں نے انہیں خواہشات پر کنٹرول کرنا یہاں تک سکھایا تھا کہ جسم گو لاغر تھے مگر روح میں وہ قوت پیدا ہوئی جس نے ان کمزور جسموں کو بجلی کی سی قوت عطا کر دی حال کی عسکری زبان میں خواہ یوں کہا جائے کہ ان کا مورال بہت بلند تھا۔ مگر یہ مورال ہے کیا چیز اور آیا کہاں سے اسی کا نام اعتماد علی اللہ ہے اور یہ پیدا ہوتا ہے خواہشات پر قابو پا کر شریعت کی پابندیوں کو دل و جان سے قبول کرنے سے۔

پھر یہ دیکھئے کہ اس وقت کی رومی اور ایرانی سلطنت آسودگی عیاشی اور خوشحالی کی کوئی کمی تھی۔ مگر چند برسوں میں دنیا کا جغرافیہ بدل کر رکھ دینے والے کیا وہ لوگ تھے جو کہتے کہ روزہ رکھنے سے کمزوری ہو جاتی ہے۔ یا حالات اس کے برعکس تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مادہ پرستوں کے ہاں زندگی اور قوت کا تصور ہی دوسرا ہے اقبال نے کہا تھا ؎

بمیری گر بہ تن جانے نہ داری
دگر جانے بہ تن داری نہ میری

مراد تو یہ ہے کہ اس جسم کے اندر اگر روحانی قوت مفقود ہے تو آدمی زندہ نہیں بلکہ چلتی پھرتی لاش ہے۔ چنانچہ وہ خود ہی کہتا ہے ؎

وہ چیز اور ہے کہتے ہیں جانِ پاک جسے
یہ رنگ و نم، یہ لہو، آب و گل کی ہے بیشی

جان پاک آب و گل کی بیشی سے نہیں آتی بلکہ اس کے سرچشمہ دوسرا ہے جس کے حصول کے لئے خالقِ جان

پاک نے ایک اُصول بتا رکھا ہے قد افلح من زکّھا وقد خاب من دسّھا۔ یعنی جس نے اس کا تزکیہ کر کے اسے لامکاں کی بلندیوں تک پرواز کرنے پر قابل بنا لیا وہ جیت گیا اور جس نے خواہشات کا غلام بن کر اس موتی کو مٹی میں ملا دیا وہ لٹ گیا۔ لہٰذا یہ روزہ تربیت ہے تزکیہ کی مشق ہے اور حقیقی قوت اسی سے آتی ہے ہاں

ع فربہی چیزے دگر آماس چیزے دیگر است

## ۲۔ امتحان:

یہ امتحان کا مہینہ ہے۔ امتحان کے لئے کئی اُمور قابل غور ہوتے ہیں۔ اوّل یہ امتحان ان لوگوں کا لیا جاتا ہے جو کسی ادارے میں داخلہ لیں اور اپنے آپ کو امتحان کے لئے پیش کریں۔ اس لئے یہاں وہی مخاطب ہیں جو مدرسۂ محمدی میں داخلہ لینے کے مدعی ہوں۔ انہیں خطاب کرتے ہوئے اسی وصف سے یاد کیا گیا کہ یا ایھا الذین اٰمنوا۔

دوم: یہ کہ امتحان کی غرض ...... امتحان لینے والے کا فائدہ اور اس کا مستقبل روشن بنانا مقصود ہوتا ہے ممتحن کا کوئی فائدہ مدنظر نہیں ہوتا۔

یہاں یہی مقصود ہے کہ امتحان تمہارا لیا جا رہا ہے جیسا کہ تم سے پہلے ایسے مدعیوں کا امتحان لیا جاتا رہا۔

تیسرا یہ کہ امتحان میں کامیابی اور ناکامی کا نتیجہ ہرگز ایک جیسا نہیں ہوتا بلکہ لازماً مختلف ہوتا ہے لہٰذا یہاں بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے اور واقعی ایسا ہوتا ہے۔

چہارم۔ امتحان میں کامیابی پر کوئی سند، ڈپلوما، ڈگری ملا کرتی ہے جو بالعموم مستقبل کی تعمیر کے لئے ضمانت ہوتی ہے۔ جہاں انسان ہی ممتحن ہوں وہاں یہ ڈگری کوئی یقینی ضمانت نہیں ہوتی اس لئے یہاں تو ڈگریاں ہاتھ میں لئے لوگ کہتے پھرتے ہیں ع

ہیں عمل اچھے مگر دروازۂ جنت ہے بند
پاس کر بیٹھے ہیں لیکن نوکری ملتی نہیں

مگر جہاں ممتحن رب العالمین ہو سند وہ عطا فرماتے اور اس کی ضمانت رحمۃ العالمین دے وہاں بات اتنی یقینی ہے کہ بے اختیار کہنا پڑتا ہے ومن اصدق من اللہ حدیثا۔

اس کھلی حقیقت کے باوجود حیرت ہے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ پر اعتماد کیوں نہیں رہا۔ آپ بھی یہ سنکر حیران نہ ہوں بلکہ اپنے گردوپیش نگاہ دوڑائیں اور آج سے پچاس برس پہلے کے حالات کا نقشہ چشم تصور کے سامنے لا کر مقابلہ کریں۔ پہلے حالت یہ تھی کہ پورے شہر میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں ملتا تھا جو سرِعام کھاتا پیتا تو دُور کی بات ہے اگر چوری چھپے بھی روزہ کھائے تو یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ کوئی شخص اس کی اس حرکت سے واقف ہے مگر آج سرِبازار یوں آزادی سے لوگ کھاتے پیتے ہیں کہ شبہ ہونے لگتا ہے یہ ملک کفرستان ہے۔ اور اس سے بڑھ کر بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ لوگ اس ڈھٹائی پر فخر کرتے ہیں۔ کوئی پوچھے تم نے کونسا قلعہ فتح کیا کہ یوں اکڑ رہے ہیں یہ صورت عدم اعتماد ہی کی نہیں

بلکہ اللہ کے مقابلہ میں ڈھٹائی کی انتہا ہے۔

روزہ جو مومن کا امتحان تھا اس کی کیفیت بھی آج کالج اور یونیورسٹی کے امتحانوں کی سی ہو گئی ہے اول تو امتحان سے جی چراتا، بہانے بنانا، تحریک چلانا احتجاجی ہڑتالیں کرنا ایسا عام ہو گیا ہے کہ ہر طالب علم یہ چاہتا ہے کہ کالج میں نام درج کریں سال بھر پوچھیں نہیں اور سال کے اختتام پر سند یا ڈگری عنایت نہ کریں بلکہ ہمارے پیش کر دیں، یہی صورت رمضان میں نظر آتی ہے جیسے مسلمانوں کا جم غفیر روزہ کے خلاف احتجاجی ہڑتال کے طور پر نکل کھڑا ہوا ہے۔

پھر امتحان میں بیٹھ بھی جائیں تو

تو گویا علین (FAIR MEEN) ہے اور کتابوں سے نقل کر کے پرچہ لکھنا گویا ان کا پیدائشی حق ہے۔ اور ان ناک کٹوں کی آبادی میں اگر کوئی نگران انہیں منع کرے تو جواب میں بندوق یا پستول کی زبان سے بات ہوتی ہے یہی حال روزہ کے امتحان کے سلسلے میں ہے کہ اگر کھانے پینے سے منہ بند بھی رکھا ہے۔ تو خواہشات پر کنٹرول کا یہ عالم ہے کہ زبان سے جھوٹ اور غیبت جاری ہے کان سارا دن "تتا" کے نغموں میں مصروف ہیں، آنکھیں بےحیائی کے مناظر دیکھنے کے لئے بیتاب ہیں، ہاتھ ملاوٹ آمیزش، کم تولنے اور ہیرا پھیری کرنے میں مصروف ہیں اور ہر شخص کا دماغ ہر وقت اسی سوچ میں محو ہے کہ کس طرح کسی سے بے ایمانی اور دھوکا کیا جائے (الا ماشاء اللہ) پھر یہ امتحان کلے کا میٹرا ایس امتحان کی ایکٹنگ ہوئی، سوانگ بھرا گیا یہ نہ سوچا کہ معاملہ جس

سے ہے وہ بڑا باریک بین ہے اور بہت بڑا نقاد ہے

## ۲۔ انعاماتِ الٰہی:۔

کسی حاکم سے یہ توقع نہیں رکھی جاتی کہ جب کوئی حکم دے اس کے ساتھ ہی اس حکم کی تعمیل کے فوائد اور نتائج بھی وضاحت سے بیان کر دے بلکہ ہوتا یہ ہے کہ حکم کی لم پوچھے بغیر اس کی تعمیل کی فکر ہوتی ہے کہ عدم تعمیل کی وجہ سے کہیں دھر نہ لئے جائیں، آپ نے سنا ہو گا کہ فوج کا ماٹو یہ ہے "سپاہی کا کام حکم ماننا" سپاہی کو اس سے بحث نہیں کہ حکم کیوں دیا گیا تعمیل اور عدم تعمیل کے فوائد اور نقصانات کیا ہیں بلکہ سپاہی کی کیفیت یوں ہوتی ہے جیسے بیلی دبائی اور سٹھاہ ہو گئی اسی طرح ادھر حکم ملا ادھر سپاہی تعمیل کے لئے دوڑ پڑا، یہ بات صرف فوج سے متعلق نہیں سول میں بھی احکام کی یہی حالت ہوتی ہے آپ سوچیں کبھی کسی نے یہ سوال کیا کہ کورٹ فیس ۵/۷ پیسے فی سینکڑہ کیوں مقرر کی گئی ہے، یا کورٹ فیس میں بیع، ہبہ، رہن میں شرح فیس مختلف کیوں ہے بلا تامل حکم کی تعمیل کے بغیر چارہ نہیں۔

اسی طرح رب العالمین کو تو یہ حق پہنچتا ہے کہ جو چاہے حکم دے اور وجہ بتائے بغیر اس کی تعمیل کا مطالبہ کرے اور بندے پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ بلا چون وچرا خالق کے حکم کی تعمیل کرے کیونکہ بندہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ پیدائش میں زندہ رہنے میں، مرنے میں، صحت میں ہر چیز میں اس کا محتاج ہے جو اس کا خالق،

مگر خالق کی رحمت کا کیا ٹھکانا کہ حکم دیتا ہے اور اپنے بندوں کی دلجوئی کے لیئے یا شفقت سے حکم کے فوائد بھی بیان فرما دیتا ہے اور یہ معاملہ ہر حکم میں نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھی اپنی حاکمانہ شان کا اظہار کرنے کے لیے حکم کی علت بتائے بغیر حکم دے دیتا ہے تاکہ اس کی صفت حکمت اور صفت حکومت دونوں ذہن میں موجود رہیں۔

روزے کا حکم دیتے ہی اس کا فائدہ یا یوں کہیئے کہ انعام کا اعلان بھی کر دیا گیا کہ لعلکم تتقون یعنی روزہ رکھو گے تو تمہاری سیرت و کردار اور تمہاری شخصیت میں ایک عظیم انقلاب آجائے گا۔ لاابالی پن ختم ہو جائے گا تم (Free Thinker) کہلاتے ہیں عار محسوس کرنے لگو گے۔ بے مہابہ بے لگام آزادی کا تصور جاتا رہے گا غیر ذمہ دارانہ رویہ سے تمہیں نفرت ہو جائے گی جہاں کوئی مادی آنکھ نہیں دیکھ رہی وہاں جرم کرنا تمہارے لیئے آگ میں کودنے کے برابر محسوس ہوگا۔ تم ایسے محتاط بن جاؤ گے کہ عملی زندگی میں ہر قدم پھونک کر رکھو گے ان تمام فضائل کے پیدا کرنے اور رذائل سے دور رہنے کے عمل کو ایک اصطلاحی لفظ تقویٰ میں سمو کر رکھ دیا کہ تم روزے رکھو گے تو تمہارے ریکارڈ میں تمہارا نام اہل تقویٰ کی فہرست میں لکھ دیا جائے گا تم دنیا میں متقی یعنی محتاط زندگی بسر کرنے لگو گے تمہارے اندر تقویٰ کا وصف پیدا ہو جائے گا۔ بہت بڑا انعام ہے حیوان اور انسان میں فرق ہی تقویٰ کے وصف سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر تقویٰ کی حقیقت سمجھے بغیر اس سند اس ڈگری اس انعام کی اہمیت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابی بن کعب سے پوچھا تھا تقویٰ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا امیر المومنین آپ کو کبھی کسی ایسے تنگ راستے سے گذرنے کا اتفاق ہوا جس کے دونوں طرف کانٹے دار جھاڑیاں یا کانٹے دار باڑ لگی ہو فرمایا ہاں ایسا اتفاق ہوا ہے۔ عرض کیا پھر آپ کیسے گذرے؟ فرمایا ایسی احتیاط سے کہ جسم سمٹا ہوا ہے کپڑے بدن سے لپیٹ رکھے ہیں کہ نہ تو کپڑے کانٹوں سے الجھیں نہ جسم پر کوئی خراش آئے۔ عرض کیا امیر المومنین یہی طرز زندگی تقویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اعتدال کی راہ جو مقرر فرمائی ہے اس میں افراط و تفریط کی بے قید وسعتیں نہیں پھر اس تنگ راہ کے دونوں طرف نفس اور شیطان، خواہشات اور لذت پرستی کی کانٹے دار جھاڑیوں کا وسیع جنگل ہے۔ تقویٰ یہی ہے اپنے آپ کو ہر خراش اور زخم سے بچا کر مومن زندگی کی راہ پر چلے۔

زندگی کی راہ میں چل پر ذرا بچ بچ کے چل
یوں سمجھ لے کوئی مینا خانہ بار دوش ہے

تقویٰ کے وصف کی بہار دیکھنا ہو تو اللہ کی کتاب کھول کے دیکھو، قدم قدم پر تقویٰ کے پھول کھلے ہیں اور ہر پھول کا رنگ جدا اور خوشبو الگ۔ مثلاً

(۱) تقویٰ کا وصف بڑا پسندیدہ اور قابل تعریف ہے

**فان ذلک من عزم الامور** (۳: ۱۸۶)

"یہ بہت بڑا ہمت کا کام ہے"

(۲) باعث حفظ و نگہداشت از دشمنان ہے۔

ان تصبروا و تتقوا لا یضرکم کیدھم شیئا
(۳: ۱۲۰)

"اگر تم صبر کروگے اور تقویٰ اختیار کرو تو دشمن کے فریب سے تمہارا کچھ نہ بگڑے گا۔"

(۳) معیّت باری کا سبب ہے

ان اللہ مع الذین اتقوا (۱۶: ۱۲۸)

"اللہ ان کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں"

(۴) مصائب سے نجات اور رزق حلال کی ضمانت:۔

ومن یتق اللہ یجعل لہٗ مخرجاً و یرزقہ من حیث لا یحتسب (۲۵: ۲)

"اور جو شخص تقویٰ اختیار کرے اللہ کرے گا واسطے اس کے راہ نکلنے کی مشکل سے اور رزق دے گا اسے ایسی جگہ سے جہاں سے اس کا گمان بھی نہ ہو۔

(۵) اصلاحِ عمل کا سبب ہے۔

اتقوا اللہ وقولوا قولاً سدیداً یصلح لکم اعمالکم (۳۳: ۷۰)

"اللہ سے تقویٰ اختیار کرو اور بات سیدھی کہو، وہ تمہارے اعمال کی اصلاح کردے گا۔

(۶) گناہوں کی بخشش کا سبب ہے۔

ویغفر لکم ذنوبکم (۳۳: ۷۰) "اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔"

۷۔ قبول عبادت کا سبب۔

انما یتقبل اللہ من المتقین (۵: ۲۷)

"سوائے اس کے نہیں کہ اللہ متقیوں کا عمل قبول کرتا ہے۔"

۸۔ عزّت و شرف کا سبب ہے: ان اکرمکم عند اللہ اتقکم (۴۹: ۱۳)

"اللہ تعالیٰ کے ہاں تم میں سے عزت اس کو زیادہ ہے جس میں تقویٰ زیادہ ہے۔"

(۹) نجات کا ذریعہ: ثم ننجی الذین اتقوا (۱۹: ۷۲)

"پھر ہم انہیں نجات دے دیں گے جو تقویٰ کی روش پر چلتے رہے۔"

(۱۰) خلود در جنت:۔ اعدت للمتقین (۳: ۱۳۳)

"جنت اہل تقویٰ کے لئے تیار کی گئی ہے۔"

خلاصہ یہ ہے کہ تقویٰ وہ انعام الٰہی ہے کہ توفیق عمل، اصلاحِ عمل اور قبولِ عمل کا مدار تقویٰ پر ہے۔ اُمید ہے اس انعام کا اندازہ کچھ تو ہو گیا ہوگا اور اس انعام کا وعدہ ان لوگوں کے لئے جو روزے کی تربیت اور امتحان سے دیانتداری اور محنت سے گزاریں

## انعام ۲:۔

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور انعام کا اعلان فرمایا۔

من صام رمضان ایماناً و احتساباً غفر لہٗ ما تقدم من ذنبہ

"یعنی جو شخص ایمان اور احتساب کے ساتھ روزے رکھے اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

اس ارشاد میں تین باتیں قابل غور ہیں جو روزے کی شرائط ہیں۔ ایک جزا ہے۔ ایمان کی شرط کی وضاحت پر لمبی تفصیل طلب ہے اس مختصر سے مقالے میں اجمال اور خلاصہ ہی دیا جا سکتا ہے مراد یہ ہے کہ یہ یقین ہو کہ رب اور بندے کا تعلق حاکم اور محکوم کا ہے۔

بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ رب کے ساتھ اطاعت کا تعلق فقط بلکے کی کارروائی نہ ہو بلکہ قلبی تعلق ہو اور رب کی عظمت کا تعلق و تصور، اپنی عاجزی کا خیال، اس کی قدرت کا خیال اپنی بے بسی کا تصور ہو اس تعلق میں ہیبت، عظمت، محبت، شوق سب عناصر پائے جائیں پھر یہ ہے کہ صرف رضائے الٰہی مقصد ہو کوئی دنیوی مفاد، نام نمود، شہرت صحت وغیرہ پیش نظر نہ ہو۔ یوں سمجھے کہ اطاعت اس لئے ہو کہ میں اطاعت کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہوں۔ ایسا کرنا گویا مقصد تخلیق کو پورا کرنا ہے۔

احتساب یہ ہے کہ صرف کھانے پینے کے لئے منہ کا پھاٹک بند نہ کیا جائے۔ بلکہ تمام قوتوں اور صلاحیتوں پر کڑی نگاہ رکھی جائے کہ کسی قوت یا صلاحیت پر اتباعِ خواہشات کی چھاپ نہ لگنے پائے پھر تمام اعضاء و جوارح کے افعال حرکات و سکنات پر نگاہ رکھی جائے کہ جسم کا کوئی عضو خواہش نفسانی کے تحت کوئی حرکت نہ کرنے پائے بلکہ اس اسلحہ سے صرف وہی کام اور اسی طرح کام لیا جائے جو اللہ و رسول کو پسند ہو۔ کیونکہ یہ اسلحہ اپنی ملکیت نہیں "سرکاری مال ہے" اپنے پاس تو بطور امانت ہے اور یہ دیکھ لیا جائے کہ سرکاری مال کا ناجائز استعمال قابلِ دست اندازی پولیس جرم ہے۔ فرق اتنا ہے کہ یہ چالان پیش اس وقت ہوگا۔ جب آنکھیں بند ہوں گی۔ یعنی روزہ صرف پیٹ کا نہ بلکہ دماغ، خیالات، آنکھ کان۔ زبان، ہاتھ، پاؤں اور قوتوں اور صلاحیتوں کا روزہ ہو کہ پوری شخصیت خواہشات کو کنٹرول میں رکھنے میں منہمک ہو۔

تیسری بات کہ اس کے سابقہ گناہ معاف کئے جائیں گے۔

اس میں کونسی کشش ہے؟ یہ حقیقت سامنے رکھیئے کہ آدمی کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ سزا سے محفوظ رہے۔ اور سزا ملتی ہی جرم پر۔ جرم نہ کرے یا ہو جائے اور معافی مل جائے تو لازماً سزا سے بچ جائے گا۔ تو اس مختصر سے جملے سے دو حقیقتیں واضح ہو گئیں۔

اوّل یہ کہ یہ تو ممکن نہیں کہ انسان سے گناہ سرزد نہ ہو۔ لہٰذا یہ بھی ممکن نہ ہوا کہ وہ سزا سے بچ سکے دوم یہ کہ اس امر کا امکان ہی نہیں بلکہ ضمانت دی جا رہی ہے کہ جرم اور گناہ معاف کئے جا سکتے ہیں گویا ضمانت دی جا رہی ہے کہ سزا سے بچایا جا سکتا ہے۔ مگر گناہ کے معاف ہونے کا ذریعہ کونسا ہے؟ یہ تو پہلے بتا دیا کہ ایمان اور احتساب کے ساتھ رمضان کے روزے رکھو، گناہ معاف یعنی سزا سے بری ہو گئے۔ پھر لطف یہ کہ جرم و سزا کا پیمانہ بھی ایسا کہ صرف ربّ العالمین اور رحمۃ للعالمین ہی کی شایانِ شان ہے۔

یعنی یہ نہیں فرمایا کہ ایک مہینے کے روزے رکھو ایک مہینہ کے گناہ معاف بلکہ اعلان یہ ہو رہا ہے کہ روزے رکھو ایک مہینے کے اور گناہ معاف ہوں گے عمر بھر کے، کیا ٹھکانہ رحمت کا اور کیا کہنا رعایت کا۔

ــــــ

می توانی کہ دہی اشک مرا حسن قبول
اے کہ دُرّ ساختۂ قطرۂ بارانی را

مگر دیکھنا صرف روزے رکھنا نہیں بلکہ ایمان اور احتساب کی شرط کے ساتھ روزے رکھنا مطلوب ہے۔

ہے کوئی جو یہ خزانہ لوٹنے کے لیے آگے بڑھنے کی ہمت کرے۔

سے

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

# توحید کا وسیع مفہوم

توحید باری مختلف حیثیتوں اور مختلف صفات پر مشتمل ہے مثلاً :-

(۱) وہ ایک ہے یعنی کائنات میں کوئی اس کی نظیر و شبیہ نہیں ۔ نہ کوئی اس کا ہمسر و برابر ہے ۔ اس لئے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے ۔

(۲) وہ ایک ہے استحقاق عبادت میں یعنی اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ۔

(۳) وہ ایک ہے یعنی ذی اجزا نہیں وہ اجزا و اعضا سے پاک ہے اس کا تجزیہ ہو سکتا ہے نہ تقسیم ۔

(۴) وہ ایک ہے یعنی اپنے وجود ازلی و ابدی میں ایک ہے ۔ وہ اس وقت بھی موجود تھا جب کوئی چیز موجود نہ تھی ۔ اور وہ اس وقت بھی موجود رہے گا جب کوئی چیز موجود نہ رہے گی ۔

اس لئے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے ۔

(جصاص بحوالہ معارف)

پروفیسر
باغ
حسین
کمال

# کایا پلٹ گئی

## سری لنکا کے ایک ساتھی کی سرگزشت

امسال دارالعرفان کے سالانہ اجتماع میں پہلے روز ہی کے ایک نوجوان کے نکلتے ہوئے قد، تیکھے سے نقوش اور سنتِ نبویؐ کے سانچے میں ڈھلے ہوئے رنگ ڈھنگ اور وضع قطع نے میری نگاہوں کو بار بار اپنی جانب متوجہ کیا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ صاحب موصوف سری لنکا کے باسی ہیں۔ سوان سے بات چیت کی خواہش پیدا ہوئی اور جب گفتگو ہوئی تو دل کی کلی کھل اٹھی۔ اس لئے کہ ان کی بات بات سے ایمان و ایقان کا نور قلب و نگاہ کو منور اور صدق و صفا کی خوشبو مشام جاں کو معطر کر رہی تھی۔ لیجئے اس نور و نکہت سے آپ بھی بہرہ ور ہوں مہمانِ عزیز کی سرگزشت انہی کی زبانی ملاحظہ فرمایئے

مجھے محمد رضا قریشی کہتے ہیں۔ سری لنکا کا رہنے والا ہوں۔ کولمبو کے مضافات میں میرا گھر ہے۔ سری لنکا کی غالب اکثریت بدھ ہے۔ کل آبادی کا پندرہ فی صد حصہ مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں پر مشتمل ہے جو تعداد کے لحاظ سے تقریباً مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ مگر مادی وسائل کے اعتبار اور اقتدار کے لحاظ سے مسلمانوں کو فوقیت حاصل ہے۔ عمر عزیز کی بائیسویں بہار دیکھ رہا ہوں اور خاصے متمول گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ والد صاحب کاروبار کرتے ہیں اور اللہ کے فضل سے دولت کی فراوانی ہے

سری لنکا میں عریانی و فحاشی کا سیلاب اُمنڈا یا ہے جس کی لپیٹ سے مسلمان بھی محفوظ نہیں رہ سکے اس کا اندازہ آپ یوں کر سکتے ہیں کہ مسلمان عورتیں بھی گھٹنوں سے اوپر تک نیکر پہننے کی عادی ہیں۔ ستر عورت کا تصور ہی مفقود ہو چکا ہے اور یوں قدم قدم پر گناہ پر اُکسانے کے مناظر دعوتِ عام دیتے ہیں۔ وہاں پر جس نوجوان کی دو چار گرل فرینڈز نہ ہوں اُسے ناکارا گردانا جاتا ہے اور دوست طعنوں سے اس کا جینا دوبھر کر دیتے ہیں اس گناہ آلودہ ماحول میں رہتے ہوئے بھی میرے دل میں دین کی محبت اور احساسِ گناہ جاگزیں رہا تو یہ محض اللہ کا کرم اور والدہ ماجدہ کی دینداری ہے میرے ننھیال والے خاصے دیندار ہیں۔ خصوصاً میرے ایک ماموں نے تبلیغی جماعت کے

ساتھ کئی چلّے کاٹے اور اب اپنے ملک میں تبلیغ دین کے لئے کوشاں ہیں۔ میں بچپن میں والدہ صاحبہ کو نماز پڑھتے دیکھتا تو ان کی نقل کرتا۔ بلکہ اکثر اپنے ہمجولیوں کے ساتھ نماز پڑھنے کا کھیل کھیلتا اور ان کی امامت کراتا۔ بچپن ہی سے میرے دل میں دین کی محبت موجزن ہے۔

چنانچہ جب میں نے پرائمری پاس کرلی تو والد صاحب سے تقاضا کیا کہ میں دینی تعلیم حاصل کرنے کا خواہشمند ہوں لیکن انہوں نے اجازت نہ دی اور کہا کہ پہلے دنیاوی تعلیم مکمل کرو۔ بعد ازاں دینی تعلیم کی طرف رجوع کرنا۔ سو انٹر پاس کرنے کے بعد میں نے پھر مطالبہ دُھرایا تو انہوں نے گریجوایشن کرنے کی شرط لگادی اور جب معاشیات میں گریجوایشن کرلی تو انہوں نے اکونٹسی کا امتحان پاس کرنے کی ترغیب دی۔ سو پچھلے سال جب یہ سفت خواں بھی طے ہوگیا تو میں نے مزید دنیاوی تعلیم کو خیرباد کہہ کر اب دینی تعلیم کے حصول کے لئے بیرونِ ملک جانے کا عزم صمیم کرلیا۔ اس لئے کہ اپنے ملک میں اس نعمت کے حصول کے مواقع ناپید تھے اہل خانہ کو بتائے بغیر پاسپورٹ بنایا گیا اور اپنے طور پر گھر سے باہر نکلنے کی تیاریاں مکمل کرلیں۔ ملک کو چھوڑنا اس لئے بھی ضروری ہوگیا تھا کہ مجھے ڈر تھا کہ اگر مزید کچھ عرصہ یہاں رہا تو میں اپنے آپ کو گناہ کبیرہ سے نہ بچا سکوں گا۔ اس لئے کہ اپنے خدوخال، قدوقامت، رنگ وروپ اور اس پر طرّہ یہ کہ ایک کرکٹر کی حیثیت سے پری چہرہ لوگوں کے لئے کچھ زیادہ ہی کشش رکھتا تھا۔ اور اب ان کی مہربانیاں کچھ اس درجہ بڑھنے لگی تھیں کہ میرے لئے ہوا و ہوس کی دلدل سے بچ نکلنا محال نظر آنے لگا۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسے پراگندہ ماحول میں بھی میرے ضمیر کی خلش برقرار رہی — مگر میرے لئے سب سے بڑا مسئلہ بیرونِ ملک جانے کے لئے والد صاحب کی اجازت کا حصول تھا۔ اس لئے کہ میرے ضمیر کی خلش ان کے لئے سرکاہ کا درجہ بھی نہیں رکھتی تھی۔ میں ان کا سب سے بڑا بیٹا ہوں وہ اعلیٰ تعلیم دلاکر مجھے کسی اعلیٰ منصب پر فائز دیکھنے کے آرزومند تھے۔ اور اس کے مقابلہ میں ان کے نزدیک دین کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ آخر کار میں نے والدہ صاحبہ کو اپنا ہمنوا بنانے کی ٹھان لی اور انہیں صاف صاف بتادیا کہ اب تک تو میں نے اپنے آپ کو گناہ سے بچائے رکھا ہے مگر اب مزید اپنے آپ کو بچانا محال ہے۔ اگر آپ مجھے نارِ جہنم سے بچانا چاہتی ہیں تو والد صاحب سے اجازت لے دیں۔ تاکہ دینی تعلیم کے حصول کے بعد خدمتِ دین کرسکوں والدہ صاحبہ نے مجھ سے اتفاق کیا اور ان کی بھرپور وکالت کے نتیجہ میں والد صاحب نے بادلِ ناخواستہ دینی تعلیم کے لئے بیرونِ ملک جانے کی اجازت دے دی۔

میں پہلے گجرات (ہندوستان) میں آیا اور وہاں ایک دینی مدرسہ میں داخلہ لیا۔ یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ مجھے تصوف سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ میں نے حضرت امام غزالیؒ اور سیّد عبدالقادر جیلانیؒ کی احیاء العلوم اور فتوح الغیب کے انگریزی تراجم مطالعہ کئے جنہوں نے میرے دل میں تصوف سے بے حد لگاؤ پیدا کردیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تصوف کے بغیر تزکیۂ باطن ممکن نہیں اور تزکیۂ باطن کے بغیر عبادات میں اخلاص پیدا نہیں ہوسکتا۔ میری خواہش تھی کہ علوم ظاہری

کے علاوہ اگر کوئی مردِ کامل میسّر آ جائے تو سلوک و تصوّف سے بھی آگاہی حاصل کروں گا۔ سو گجرات میں میری جستجو جاری رہی۔ آخر بتایا گیا کہ ایک بزرگ میرے درد کی دوا کر سکتے ہیں۔ سو ان کی خدمت میں حاضری دی۔ انہوں نے ذکرِ لسانی تعلیم کیا۔ میں اس ذکر پر قائم رہا لیکن میرے باطن میں کوئی تبدیلی محسوس نہ ہوئی۔ سو میرا دل وہاں نہ لگا اور میں نے پاکستان آنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے کراچی آیا مگر یہ شہر بھی مجھے اپنی مغربی تہذیب کی جلوہ سامانیوں کی وجہ سے پسند نہ آیا۔ وہاں سے کسی سے دارالعلوم فیصل آباد کی بڑی تعریف سنی سو وہاں آ گیا۔ اور دارالعلوم میں داخلہ لے لیا۔ مگر میرے لیے دینی تعلیم کے حصول میں رکاوٹ یہ تھی کہ میں اردو سے نابلد تھا اور میرے اساتذہ انگریزی سے ناآشنا۔ سو میں نے پہلے اردو سیکھنے کا عزم کیا۔ چنانچہ چند ماہ تک میں نے اپنی تمام تر توجہ اردو زبان سیکھنے پر مرکوز رکھی اور شبانہ روز محنت کے نتیجہ میں اللہ کریم نے یہ استعداد پیدا فرما دی کہ آسانی سے آسان اردو لکھ اور پڑھ سکوں۔ عربی میں نے اپنے ملک میں بھی کسی حد تک بذریعہ انگریزی پڑھ رکھی تھی۔ اب اردو کے ذریعہ عربی زبان اور دین کی تعلیم حاصل کر رہا ہوں اور ان دنوں تفسیر جلالین کا درس لے رہا ہوں۔

دارالعلوم میں ہی ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یوں لگا جیسے میں پھر شیطان کے چنگل میں آنے لگا ہوں۔ ہوا یوں کہ دارالعلوم میں بعض افریقی ممالک اور کینیڈا کے چند طلبہ بھی زیرِ تعلیم ہیں وہ سب انگریزی دان ہیں ان سے دوستی قائم ہوئی تو ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے لگا۔ انہوں نے انگریزی گانوں کی بہت سی کیسٹیں رکھی ہوئی تھیں ان کے ساتھ گانا سننے اور فلمیں دیکھنے کا معمول بن گیا۔ جس کے نتیجہ میں آزاد خیالی اور گمراہی کا شکار ہو گیا اور نوبت بایں جا رسید کہ نماز ترک ہو گئی۔ آخر ایک روز مجھے احساس ہوا کہ جس بلا سے نجات حاصل کرنے کے لیے ماں باپ اور احباب کو چھوڑا، ملک سے منہ موڑا اگر یہاں بھی وہی کچھ کرتا ہے اور دینی تعلیم شیطنت کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتی تو یہاں ٹھہرنا بے کار ہے اسی سوچ بچار میں چند روز کے لیے میں نے ان دوستوں سے اجتناب اختیار کر لیا اور اپنے آپ کو اپنے کمرے میں ایک طرح سے مقید کر لیا اور اپنی تمام تر توجہ مطالعہ کی طرف مبذول کر دی۔ چند روز بعد میں وضو کر رہا تھا کہ قریب ہی دارالعلوم کے ایک طالب علم اللہ نور صاحب بھی وضو کر رہے تھے۔ مجھے ان میں عجیب سی کشش محسوس ہوئی میرا جی چاہا کہ میں ان سے اپنی کیفیت کا اظہار کروں سو میں نے اپنا تعارف کرایا، مشکل بیان کی اور عرض کیا کہ کیا آپ تصوّف کی کسی انگریزی کتاب کی نشان دہی کر سکتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہاں میرے مرشدِ گرامی کی کتاب "دلائل السلوک" کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے وہ کل تک آپ کو پیش کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اگلے روز انہوں نے کسی ساتھی سے یہ کتاب منگوائی اور مجھے دے دی میں نے کتاب پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ قرآن اور حدیث کی رُو سے تصوّف کی اہمیت جس انداز میں اجاگر کی گئی تھی اور منازلِ سلوک کی جو نشان دہی کی گئی تھی اس سے مجھے محسوس ہوا کہ اس کتاب کے مصنف کی ہستی صحیح طور پر راہِ سلوک سے آگاہ ہے اور راہنمائی کر سکتی ہے۔ چنانچہ میں نے اللہ نور صاحب

سے عرض کیا کہ میں حضرت اللہ یار خان صاحب کی خدمت میں حاضری دینے کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ کل ہمارے ایک بزرگ ساتھی حضرت مولانا محمد اکرم صاحب مناروی تشریف لا رہے ہیں۔ آپ پہلے ان سے مل لیں۔ بعد میں اعلیٰ حضرت کی خدمت میں بھی لے چلیں گے چنانچہ اگلے روز حضرت مناروی سے ملاقات نصیب ہوئی موصوف سے مل کر یوں محسوس ہوا جیسے تشنہ لب چشمۂ آب حیواں پر پہنچ چکا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اعلیٰ حضرت کل سرگودھا تشریف لا رہے ہیں آپ ساتھیوں کے ساتھ وہاں پہنچیں۔ چنانچہ دوسرے دن وہاں پہنچکر اعلیٰ حضرت شیخ الکرم کی زیارت سے مشرف ہوا۔ حضرت جی نے بہت شفقت فرمائی اور ساتھیوں کے ساتھ ذکر کرنے کا حکم دیا چنانچہ رات اور سحری کے ذکر کے معمول میں شریک ہوا۔ صبح کچھ لوگوں کو حضرت جی کی بیعت کے لئے پیش کیا گیا تو بے اختیار میرا دل بھی بیعت کے لئے بے قرار ہو گیا۔ سو بیعت بھی حاصل ہو گئی۔ ایک دن کے بعد واپس دار العلوم فیصل آباد آگیا اور دونوں وقت کے ذکر کو اپنا معمول بنا لیا۔ مگر چند روز بعد پھر جی چاہا کہ حضرت جی کے پاس حاضری دوں چنانچہ چکوال گیا اور وہاں ہفتہ بھر حضرت کی شفقت سے مستفیض ہوتا رہا۔ الحمد للہ اب "دار العرفان" کے سالانہ اجتماع میں پہلے روز ہی یہاں پہنچ گیا ہوں۔ اور اب الحمد للہ میری کیفیت یہ ہے کہ اگر میں یہ کہوں کہ مجھے عبادات و اعمال میں سو فیصد اخلاص حاصل ہو گیا اور ایمان و ایقان کے نور کی لازوال قندیل میرے دل میں روشن ہو گئی تو یہ مبالغہ نہ ہو گا۔

چند ماہ قبل مجھے والد صاحب نے ٹکٹ بھیجا کہ ہفتہ بھر کے لئے گھر آجاؤں سو گھر گیا مگر اس حالت میں کہ میں نے گھر والوں کو سختی سے منع کر دیا کہ میرے کسی دوست یا کسی گرل فرینڈ کو میرے آنے کی خبر نہ دی جائے (ہمارے معاشرے میں گرل فرینڈز کا گھر پر آکر ملنا معیوب نہیں سمجھا جاتا) اور اگر کسی کا فون آجائے تو مجھے گفتگو کے لئے ہرگز نہ بلایا جائے اور اس پر بھی اگر کوئی گھر پر آن دھمکے تو مجھے ملائے بغیر اسے واپس بھیج دیا جائے ایک روز مجھے مجبوراً شہر جانا پڑا مگر اس حالت میں کہ اگرچہ میں کار چلا رہا تھا مگر میری نظریں جھکی ہوئی تھیں اور ہر لمحہ میں چوکس رہا کہ میری نظر کسی نامحرم عورت پر نہ پڑ جائے۔

چند روز بعد والدہ صاحبہ نے شادی کا تذکرہ چھیڑ دیا میں نے ہاں تو کر دی مگر ساتھ ہی ایک شرط بھی لگا دی کہ جہاں آپ رشتہ کرنے کے خواہاں ہیں وہ دولت مند اور صاحب اقتدار گھرانہ ہے۔ لڑکی اُلٹرا ماڈرن ہے میرے اور اس کے افکار و خیالات اور طرز حیات میں اب بعد المشرقین پیدا ہو چکا ہے۔ اس لئے اسے رفیقۂ حیات بنانے سے قاصر ہوں، میری شرط ہے کہ لڑکی بے شک غریب خاندان سے ہو مگر وہ صوم و صلوٰۃ کی پابند ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے پابند پردہ ہو کر برقعہ اوڑھنا ہو گا۔ اور برقعہ بھی وہ روایتی برقعہ جو سارے جسم کو ڈھانپ لیتا ہے۔

سری لنکا میں بے پردگی کا یہ عالم ہے کہ ملک بھر میں اس وقت صرف چار عورتیں برقعہ اوڑھتی ہیں ان کے خاوند تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا برقعہ

بھی فیشنی طرز کا نقاب والا پاکستانی برقعہ ہوتا ہے مگر میری بیوی انشاء اللہ ملک بھر میں پہلی عورت ہو گی جو ٹوپی والا ڈھیلا ڈھالا روایتی طرز کا برقعہ اوڑھے گی۔ اس لئے کہ کما حقہٗ پردہ صرف اسی برقعہ میں ممکن ہے۔ میں نے فیصل آباد سے دو برقعے سلوا لئے ہیں۔ برقعہ والی شرط ہمارے ماحول کے لحاظ سے کچھ انوکھی اور ناقابل عمل سی قرار پائی۔ سب نے مذاق اڑایا مگر میں اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ آخر بڑی لے دے کے بعد جب میرے گھر والوں نے لڑکی کے سامنے میری شرط پیش کی تو اس نے بخوشی قبول کر لی۔

اس طرح یہ مسئلہ بخیر و خوبی حل ہو گیا۔ اور منگنی قرار پا گئی اور اب اگلے ماہ انشاء اللہ شادی ہو جائے گی۔ میری کوشش ہو گی کہ گھر جا کر اہل خانہ اور دیگر رشتہ داروں کے سامنے اسلامی طرز حیات کا مکمل نمونہ پیش کروں۔

اور

ذکر الٰہی کی برکات سے آگاہ کروں اور پھر یہ چراغ جلاتا ہی چلا جاؤں۔ اللھم ارزقنا حبک وحب حبیبک

---

حضرت سہل بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ **نجات** تین چیزوں میں منحصر ہے

- حلال کھانا۔
- فرائض ادا کرنا اور
- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرنا۔

حافظ عبدالرزاق
ایم۔اے

# کُونُوا عِبَادَ اللّٰہِ

**۵۔ ذکر الٰہی کی کثرت:**

خود شناسی، تعمیر سیرت اور اصلاح معاشرہ کے سلسلے میں جن اُمور کی نشاندہی گزشتہ صفحات میں کی جا چکی ہے

ان سب کے لئے خصوصی توجہ، محنت اور مجاہدہ درکار ہے اور سچ تو یہ ہے کہ کوئی کام خواہ وہ معمولی قسم کا ہو یا خاص اہمیت رکھتا ہو توجہ اور محنت کے بغیر کما حقہ، ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔

اب تک چار اہم اُمور پر بحث کی گئی ہے اوّل سوچ کا رُخ صحیح سمت کو موڑ کر عمل کے لئے فکری بنیاد تیار کرنا۔

دوم اپنے خالق سے اطاعت کا عہد کر کے عملی ثبوت کی ابتداء کرنا جس کی صورت دن بھر میں پانچ مرتبہ اپنے خالق کے دربار میں حاضری دینے اور اس کی ملاقات کرنے اس کے گھر جانے کی پابندی کرنا۔ اور اس ملاقات کے دوران جو کچھ زبان سے کہا جائے۔ عمل اس کی شہادت اس طرح دے کہ روزمرہ زندگی میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں کمی نہ آنے پائے۔

سوئم: یہ روزمرہ پانچ وقت کی حاضری اپنا اثر بھی دکھائے جو خالق نے اس میں رکھا ہے کہ نماز بے حیائی اور بُرے کاموں سے روکتی ہے اور کام یا عمل کے لئے قوت جسمانی درکار ہے اور قوت غذا سے حاصل ہوتی ہے

لہٰذا نماز کا حقیقی اور کامل اثر مرتب ہونے کے لئے رزق حلال کا خاص اہتمام کیا جائے اور حرام سے دلی نفرت ہونے لگے۔

چہارم۔ برائیوں کی جڑ یعنی جھوٹ سے مکمل پرہیز اور بھلائیوں کے سرچشمہ یعنی راستبازی کا خاص اہتمام کیا جائے۔

یہ چاروں اُمور محنت اور قربانی چاہتے ہیں کہیں خواہشات کی قربانی ہے کہیں مشاغل اور کاروبار پر زد پڑنے کا خطرہ ہے لیکن وقت کی قربانی اور کہیں عیش و لذت کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ اس مشکل کو آسان کرنے کا ایک نسخۂ کیمیا ہے جسے محبت کہتے ہیں یعنی مقصد سے محبت اگر دل میں پیدا ہو جائے تو بڑی سے بڑی قربانی دینا بھی آسان ہو جاتا ہے نہیں بلکہ قربانی دینے کے لئے آدمی بے قرار اور سراپا شوق بن جاتا ہے۔ اس دولت کے خزانے کے نشاندہی خود خالق نے فرما دی اور کس پیارے انداز میں فرمائی کہ اے میرے محمدؐ سے اطاعت و وفاداری کا عہد کرنے والو کثرت سے مجھے یاد کیا کرو۔

یا ایھا الذین امنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیراً۔

اس ذکر کثیر اور اطاعت و وفاداری کا آپس میں کیا

رشتہ ہے، ہاں تو وہ رشتہ یہ ہے کہ فاذکرونی اذکرکم تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ پھر کیا ہوگا؟ تمہارے کثرت ذکر سے جو میرے دربار میں مقبولیت ہوگی تو اس کا اثر لازماً یہ ہوگا کہ تمہارے دل میں میری محبت جاگزیں ہو جائے گی۔ یہ حقیقت تو اہل دنیا کے ہاں بھی ضرب المثل بن چکی ہے کہ من احب شیئ اکثر ذکرہ یعنی ذکر اور محبت لازم و ملزوم ہیں ذکر الٰہی کی اس تاثیر یا اہمیت کا اعلان خالق اکبر نے ان الفاظ میں فرما دیا کہ ولذکر اللہ اکبر اللہ کی یاد سب سے بڑی چیز اس لئے ہے کہ اس کے ذریعے سب سے بڑی چیز یعنی محبت الٰہی پیدا ہوتی ہے اور نتیجۃً سب سے بڑی چیز حاصل ہوتی ہے اور وہ ہے رضائے الٰہی۔ اللہ تعالےٰ نے ان دونوں کے لئے ایک ہی صفت استعمال فرمائی ہے کما قال تعالیٰ ولذکر اللہ اکبر اور رضوان من اللہ اکبر۔ یعنی اس بڑی چیز کے ذریعے وہ بڑی چیز حاصل ہوگی۔

شیخ الہند فرماتے ہیں "اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے وہ چیز ہے جسے نماز اور جہاد وغیرہ تمام عبادات کی روح کہہ سکتے ہیں یہ نہ ہو تو عبادت کیا ہے؟ ایک جسد بے روح ایک لقطہ بے معنی"۔

ابوداؤد وغیرہ کی احادیث کو دیکھ کر علماء نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ذکر اللہ سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں اصلی فضیلت اسی کو ہے یوں عارضی اور وقتی طور پر کوئی عمل ذکر اللہ سے سبقت لے جائے تو وہ دوسری بات ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس عمل میں بھی فضیلت اس ذکر اللہ کی بدولت آئی ہے بہرحال ذکر اللہ تمام عبادات سے افضل ہے"۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنی مشہور تفسیر عزیزی میں فرمایا ہے "ذکر سبب ہے استعداد کی صفائی کا اور کمالات کی زیادتی کا اور جس قدر کہ ذکر میں تام پروردگار کا زیادہ لیا جاتا ہے اسی قدر معرفت کا درخت بڑھتا ہے"

یعنی ذکر اللہ کی تین خاصیتیں آپ نے بیان فرمائیں اول یہ کہ انسان کے اندر شرف و عظمت کا جو جوہر رکھا ہے اور حصول کمال کے لئے جو استعداد رکھی ہے ذکر الٰہی سے اس میں جلا آتی ہے۔ اور وہ استعداد ترقی کر کے عمل کی صورت اختیار کرتی ہے۔

دوم یہ کہ کمالات انسانی میں کماً و کیفاً ذکر الٰہی سے زیادتی حاصل ہوتی ہے۔

سوم یہ کہ ذکر الٰہی سے معرفت میں ترقی ہوتی ہے اور اس معرفت کے دو رُخ ہیں ایک معرفت نفس دوسرا معرفت الٰہی جبھی تو کہا گیا ہے کہ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ حقیقت یہ ہے کہ جب تک حقیقی خود شناسی حاصل نہ ہو خدا شناسی حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔

اس کا ماحصل یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ گمراہی پھیلی ہے اور انسان کے اخلاق و اعمال میں جو فساد بھی رونما ہوا ہے اس کا سبب صرف یہ ہے کہ انسان اس بات کو بھول جاتا ہے کہ اللہ اس کا رب ہے اور وہ اللہ کا بندہ ہے لہٰذا جو شخص راہ راست پر چلنا اور دنیا کو اس پر چلانا چاہتا ہے اس کے لئے نماز، ذکر الٰہی اور دائمی توجہ الی اللہ کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔

مولانا محمد الیاسؒ کو کون نہیں جانتا یہ تبلیغی جماعت انہی کا لگایا ہوا پودا ہے اور تبلیغ بیشک اہم کام ہے مگر جو چیز جتنی اہمیت کی حامل ہو اس کو اتنی ہی اہمیت دینا اور افراط و تفریط سے کام نہ لینا ہی حق شناسی ہے۔ ذکر الٰہی کے متعلق اس مردِ حق آگاہ کے ارشادات سُنیئے فرماتے ہیں:۔

۱۔ آپ لوگوں کی یہ ساری چلت پھرت اور ساری جدوجہد بیکار ہوگی۔ اگر اس کے ساتھ علم دین اور ذکر اللہ کا پورا اہتمام آپ نے نہیں کیا۔ گویا علم و ذکر دو بازو ہیں جن کے بغیر اس فضا میں پرواز نہیں کی جا سکتی"

۲۔ علم و ذکر ابھی تک ہمارے مبلغین کے قبضے میں نہیں آیا اس کی مجھے بڑی فکر ہے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ ان لوگوں کو اہلِ علم اور اہلِ ذکر کے پاس بھیجا جائے اور ان کی سرپرستی میں تبلیغ بھی کریں۔ اور ان کے علم و صحبت سے مستفید بھی ہوں

۳۔ علم دین اور ذکر اللہ کے اہتمام کے بغیر نکلنا (تبلیغ کے لئے) کچھ بھی نہیں۔

یہ نگرانی اور رہنمائی میں تکمیل کرنا اور ذکر نہیں کیا یہ سب صرف تین تسبیح سیکھنے کے لئے ہوتا ہے یا سلوک تصوف و تزکیہ میں ہوتا ہے۔

اسی طرح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا "ایک نصیحت آمیز اور ترغیبی خط" میں فرماتے ہیں۔

(۱) روح کا حفاظتی قلعہ کیا ہے۔ وہ ذکر اللہ ہے جو ساری عبادات، نماز، جہاد وغیرہ اور تبلیغ کے چھ نمبروں کی بھی روح ہے۔

۲۔ علم و ذکر کی اہمیت کو اس سلسلہ میں کبھی فراموش نہ کیا جائے اور اس کا ہمیشہ خاص اہتمام کیا جائے ورنہ آپ کی یہ تبلیغی تحریک بھی ایک آوارہ گردی ہو کر رہ جائے گی۔

۳۔ ذکر الٰہی اللہ جل شانہٗ کی محبت پیدا کرتا ہے اور محبت ہی اسلام کی روح اور دین کا مرکز ہے اور سعادت و نجات کا مدار ہے۔ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ کی محبت تک اس کی رسائی ہو اس کو چاہیئے کہ ذکر کی کثرت کرے جیسا کہ پڑھنا اور تکرار کرنا علم کا دروازہ ہے۔ اسی طرح اللہ کا ذکر اس کی محبت کا دروازہ ہے"

۴۔ ذکر تصوف کا اصل اصول ہے اور تمام صوفیاء کے سب طریقوں میں رائج ہے جس شخص کے لئے ذکر کا دروازہ کھل گیا اس شخص کے لئے اللہ جل شانہٗ تک پہنچنے کا دروازہ کھل گیا۔

۵۔ تمام اعمال اللہ کے ذکر ہی کے واسطے مقرر کئے گئے ہیں۔

۶۔ اللہ اللہ کرتے کا سلسلہ بڑھاؤ۔ اللہ کا نام جہاں کثرت سے لیا جائے گا وہاں فتنہ نہ ہوگا۔ اللہ کا ذکر حوادث و فتن میں سدِ سکندری ہے۔

ذکر کو رواج دو۔

ایک صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ریا سے عمل ضائع ہو جاتے ہیں مگر اللہ کا نام اگر دکھاوے کے لئے بھی لیا جائے تو وہ اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے۔ لہٰذا آپ تجربہ کے طور پر ہی سہی مگر خلوص دل سے ذکر الٰہی کرنا شروع کر دیں۔ پھر دیکھیں کہ اللہ کا نام اپنا اثر کیونکر دکھاتا ہے ؎ بیا بمجلس اقبال یک دو ساغر کش ؛ اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

# ذکرِ الٰہی
# کیوں اور کیسے

مولانا محمد اکرم صاحب

انسانی وجود صنعت باری کا عجیب شاہکار ہے۔ رب العالمین نے مختلف عناصر کو ایک خاص ترکیب سے اور ایک خاص نسبت سے آمیزش دیکر اس کے جسم کی تخلیق فرمائی ہے اور اس مادی وجود کے ساتھ اس روح کا تعلق اور رابطہ قائم کر دیا ہے جو لطیف ترین شے ہے حتیٰ کہ پوری مخلوق فرشتے سے بھی لطیف تر ہے۔ اور اس تعلق میں خداوند عالم نے کچھ ضوابط کچھ اصول و قوانین مقرر فرمائے ہیں جہاں تک جسم یعنی مادیات سے متعلق علوم و فنون کا تعلق ہے اس نعمت کو عام فرد خواہ مرد ہو یا عورت مومن ہو یا کافر نیک ہو یا بد جو بھی ان علوم و فنون کو سیکھنے کے لئے محنت کرے بقدر سعی و استعداد انہیں حاصل کر سکتا ہے آپ نے فن طب میں مہارت رکھنے والے کافر طبیب بھی دیکھے ہوں گے اور مومن بھی۔ اور آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ طب یا میڈیکل سائنس کا موضوع یہ ہے کہ عناصر اربعہ کی ان کیفیات کا علم اور تجربہ حاصل کرنا جنہیں متوازن رکھ کر جسم کا روح سے تعلق قائم رکھا جا سکتا ہے اگرچہ روح عالم امر کی چیز ہے اور اس لطیف ترین شے کا تعلق مادی اور کثیف بدن سے قائم رکھنا ایک عجوبہ ہے۔ مگر دیکھا گیا ہے کہ ماہر طبیب نبض پر ہاتھ رکھتے ہی امراض کی فہرست پڑھنا شروع کر دیتا ہے ایسا کیوں ہے؟ وجہ یہ ہے کہ طب مشرق کی رُو سے بیماری کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ چار خلطوں میں سے کوئی خلط مطلوبہ مقدار سے بڑھ جاتی ہے یا کم ہو جاتی ہے اور طبیب کو نبض پر ہاتھ رکھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کونسی خلط میں کیا تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اب طبیب اپنے علم اور تجربہ سے یہ اخذ کر لیتا ہے کہ اس تبدیلی کے اثرات کیا ہیں۔ بس طبیب ان ہی اثرات کی گردان شروع کر دیتا ہے۔ فن سے ناواقف آدمی حیران رہ جاتا ہے بہر حال عناصر کا یہ عدم توازن بڑھتے بڑھتے جب ایک خاص حد تک پہنچ جاتا ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے یعنی روح کا اس جسم سے تعلق کی کیفیت کا جاننا بھی ایک مخصوص علم ہے اور اس کے ماہر اور امام انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں رُوح کے متعلق علوم و فنون کی واقفیت یا مہارت پیدا کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں بلکہ یہ فن انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے صرف مومنین کاملین کا خاصہ ہے۔

روح کی صحت اور بقا کا انحصار صرف تعلق باللہ پر ہے

ذاتِ باری سے جس روح کا ربط جس درجے کا ہوگا اس کی صحت اور قوت بھی اسی درجہ کی ہوگی۔ جوں جوں یہ قرب بڑھتا جائے گا روح کی صحت اور قوت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اس تعلق میں جوں جوں کمی ہوگی روح کی بیماری اور پریشانی بڑھتی چلی جائے گی حتیٰ کہ یہ بگاڑ جب ایک خاص نقطہ پر پہنچ جاتا ہے تو روح کی موت واقع ہو جاتی ہے اور روح کی موت کیا ہے؟ ۔ ذاتِ باری سے اس کا تعلق منقطع ہو جانا مگر وہ تعلق جو مظہرِ رضا ہے کیونکہ کسی قسم کا تعلق تو قائم رہتا ہے مثلاً غضب، اور گرفت کا تعلق تو قائم رہے گا۔ روح کے لئے فناء نہیں۔ ہاں کیفیت بدل جائے گی یعنی رحمت اور رضا کی جگہ غضب۔

روح پر رحمتِ باری کا سبب بھی جسم انسانی ہی بنتا ہے۔ اگر روح وجود انسانی میں داخل نہ ہو تو منازلِ قرب نہیں پا سکتا۔ روح اگر جسم سے الگ عالمِ امر میں ہی رہے تو اسی حال پر قائم رہے جس میں اسے پیدا کیا گیا۔ قربِ الٰہی حاصل کرنے کے لئے روح کو بدنِ انسانی کی ضرورت ہے جس طرح بدن کی ایک خاص کیفیت کو روح کے ساتھ تعلق رکھنے میں دخل ہے یا اس کا سبب بنتا ہے اسی طرح اسی وجود کے ایک خاص ٹمپریچر کو، خون کی ایک خاص حدت کو انوارات کے جذب کرنے میں دخل ہے۔ ایک شخص نہایت سکون اور خاموشی سے بیٹھا اللہ اللہ کرتا رہے تو یہ ذکر ضرور ہوگا دل پر اثر بھی کرے گا مگر اس انداز سے ذکر کرنے میں خون میں ایک خاص درجہ کی حدت پیدا کرنے کے لئے صدیاں درکار ہوں گی تاکہ اس میں انوارات جذب کرنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

ہمارے سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ میں جو طریقہ ذکر رائج ہے اسے اصطلاحِ تصوف میں پاس انفاس اور ذکرِ ارّہ کہتے ہیں۔ یہ تدبیر یا طریقۂ ذکر اس فن کے ماہرین حضرات کی عمر بھر کے کامیاب تجربے کا ماحصل ہے ذکر کراتے وقت تاکید کی جاتی ہے کہ خوب زور سے ذکر کرو اور ہر سانس کی نگرانی کرو کہ کوئی سانس ذکر سے خالی نہ جائے زور سے ذکر کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اس طرح انسان اپنی پوری توجہ سانس پر مرکوز کر سکتا ہے کہ سانس اندر جائے تو خیال ہو اللہ اور باہر نکلے تو خیال کرے ھُو۔ لفظ اللہ اور ھُو بنانا یا ان کا تلفظ مقصود نہیں ہوتا بلکہ یہ خیال کرنا ہوتا ہے کہ ہر سانس کے ساتھ جو اندر جاتا ہے لفظ اللہ دل کی گہرائیوں میں داخل ہو رہا ہے اور ہر خارج ہونے والے سانس کے ساتھ لفظ ھُو کا شعلہ بلند ہو رہا ہے جب سانس اتنی قوت سے اور تیزی سے چلے گا تو خون کو وہ ٹمپریچر دے گا وہ مخصوص کیفیت دے گا جو جذب انوارات کے لئے ضروری ہے جو کام برسوں میں ہونا تھا وہ دنوں میں ہوگا۔ باقی سلسلہ ہائے تصوف میں اس کام کو کئی برس لگائے جاتے ہیں پھر کہیں جا کر لطائف منور ہوتے ہوتے ہیں اس سلسلہ میں سارے لطائف ایک ہی توجہ میں تعلیم کئے جاتے ہیں اس کی وجہ ہے کہ باقی حضرات سالک کی تربیت کا کام ذکر لسانی سے شروع کرتے پھر اس کے مختلف مدارج بناتے ہیں مثلاً پہلا درجہ لا الٰہ الا اللہ دوسرا درجہ الا اللہ تیسرا درجہ اللہُ اللہ چوتھا درجہ ھُو پھر اس کے بعد دل کی طرف متوجہ ہو کر خاموشی سے بیٹھے رہنا ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اُن حضرات کے ہاں اخذ فیض کا طریقہ صرف یہ ہے کہ سوائے زندہ شیخ کے کسی سے اخذ فیض نہیں کر سکتے اور یہ طریقہ بھی فنا بقاء تک کام دیتا ہے اس سے آگے منازل بالا میں لازماً ارواح کے ساتھ ربط پیدا کرنا ہوتا ہے اور ان ارواح سے ربط قائم کرایا جاتا ہے جو براہِ راست روح آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم سے مستفیض ہوں۔

ہمارے سلسلہ میں خصوصیت یہ ہے کہ ابتدا ہی سے شیخ براہِ راست آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ اطہر سے انوارات اپنے دل میں جذب کر کے طالب کے قلب پر انڈیل دیتا ہے۔ یہ کام تو شیخ کا ہے مگر اس توجہ کے اثرات اور انوار قبول کرنا اور جذب کرنا طالب کا کام ہے آپ دیکھتے نہیں کہ بارش کا برسنا تو عام ہے مگر سنگلاخ زمین اس پانی کو جذب نہیں کر سکتی بلکہ وہ پانی پتھر سے پھسل کر بہ جاتا ہے مگر نرم زمین بارش کے پانی کو جذب کرتی ہے مگر روئیدگی اور ثمرات حاصل کرنے کے لئے پانی کے جذب ہونے پر اکتفا نہیں کی جاتی بلکہ اس کے بعد ہل چلانا، بیج ڈالنا، گوڈی اور نلائی کرنا اور فصل کی رکھوالی کرنا سب ضروری مراحل ہیں اور یوں سمجھیے کہ یہ سب طلب کے مراحل ہیں جس نسبت سے طلب بڑھے گی اسی نسبت سے شیخ کی توجہ میں اضافہ ہوگا اور طالب کے قلب میں انجذاب کی کیفیت ترقی کرے گی۔ یہ ایک فطری ضابطہ ہے آپ دیکھتے نہیں کہ بچہ جب روتا ہے تو ماں کی چھاتیوں میں دودھ اُتر آتا ہے یہی حال شیخ کا ہے کہ طالب میں طلب اور جذب کی استعداد جب ترقی کرتی ہے تو شیخ کی توجہ خود بخود اس کی طرف ہونے لگتی ہے اگر کوئی بے ذوق ہو کر مدتوں بیٹھا رہے اس کی طرف توجہ نہیں ہوتی شاید اسی سنت اللہ کے پیش نظر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دعا کے لئے ہاتھ اُٹھیں مگر دل متوجہ نہ ہو تو وہ ہاتھ خالی ہی لوٹتے ہیں بلکہ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ سینکڑوں آدمیوں میں اگر ایک شخص بے ذوق ہو کر بیٹھا ہے تو سب اہل ذوق پر شیخ کی توجہ ہوگی مگر اس بے ذوق پر نہیں ہوگی اس کے قلب کی طرف انوارات نہیں جائیں گے معلوم ہوا کہ اس راہ میں طلب اور طلب صادق پہلا قدم ہے۔ مگر صرف طلب کافی نہیں بلکہ اس خاص استعداد کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو ان کیفیات کو جذب کر سکے اسی غرض سے تیزی سے اور قوت سے سانس کے ذریعہ ذکر کرایا جاتا ہے اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ذہن پراگندہ نہیں ہوتا طرح طرح کے خیال نہیں آنے پاتے۔ پھر جب ادھر پوری توجہ ہو جاتی ہے تو اس تصور کا تعلق سانس سے نہیں بلکہ اسم ذات سے ہو جاتا ہے۔

طب جسمانی کے اعتبار سے اس عمل کی خصوصیت یہ ہے کہ جب سانس تیزی سے چلتا ہے تو خون میں ایک خاص حدت پیدا ہو جاتی ہے اور اس میں انوارات جذب کرنے کی استعداد اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے جو عالم بالا سے نازل ہوتے ہیں کیونکہ روح کو منازل قرب حاصل کرنے کے لئے بدن کی شرکت ضروری ہے اس لئے بدن کی خاص کیفیات کو اس بات سے خصوصی تعلق ہے کہ کونسی کیفیت کس درجہ کے انوارات کو قبول کر سکتی ہے

اگر روح میں قبولیت کی استعداد اور قوت پیدا نہ ہو تو طالب کا قلب شیخ کی توجہ کے انوارات کو پٹک دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ مکہ کے رہنے والے بعض افراد آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قدر مادی قرب میسر آنے کے باوجود قرب حقیقی کی دولت سے محروم ہی رہے۔ حالانکہ حضور اکرمؐ کے قلب اطہر میں اتنی قوت ہے کہ آپ پوری کائنات میں فیضان باری کو تقسیم کرنے والے ہیں۔ فرشتے ہوں یا انبیاء، جن ہوں، یا انسان کائنات بسیط کا ایک ایک ذرہ تجلیات باری کو اخذ کرنے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محتاج ہے آپ کی ذات نور کا وہ مینار ہے جو ساری کائنات کو نور تقسیم کرتا ہے۔ پھر حیرت ہے کہ اتنا بڑا خزینہ جن لوگوں کے پاس ان کی مادی زندگی میں موجود رہا وہ اس خزینہ سے اخذ فیض کرنے سے محروم رہے۔ جس ہستی کے فیضان سے صدیوں بعد بھی لوگ زمین پر بستے ہوئے عرش معلیٰ کی باتیں کرتے ہیں اور صورتش بر خاک وجاں در لامکاں کی زندہ مثالیں ہیں کیا ان لوگوں کی محرومی کی وجہ یہ تھی کہ حضور اکرمؐ بعض لوگوں کے لئے توجہ فرماتے تھے اور بعض کے لئے نہیں؟ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ حضورؐ کو تو رحمۃ اللعالمین بنا کے بھیجا گیا تھا لہٰذا تقسیم فیضان میں حضورؐ نے کبھی کمی نہیں کی اگر فرق تھا تو اخذ فیض میں۔ جن لوگوں نے اپنے قلوب میں اخذ فیض کی استعداد پیدا نہ کی، ارادہ نہ کیا، توجہ نہ کی وہ محروم ہی رہے اور جو متوجہ ہوئے وہ نہال ہو گئے ؎

ہمارے ظرف ہی انعام کے قابل نہیں ورنہ
لنڈھائے خم کے خم اوروں پہ کیوں ممکن تھا گر ساقی

اخذ فیض میں کوتاہی اور کمی کی وجہ سے اُس دربار سے محرومی ہو سکتی ہے تو کسی ولی کی صحبت میں رہ کر اس کے فیض سے محروم رہنا کونسی تعجب کی بات ہے۔

اخذ فیض کے لئے طالب کا صرف متوجہ ہونا کافی نہیں بلکہ اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ اعمال کے ذریعہ اپنے اعضاء جوارح میں، اپنے وجود میں اخذ فیض کی استعداد بھی پیدا کرے۔ ان اعضاء وجوارح سے اعمال صالحہ کے لئے اکل حلال شرط ہے، طیب غذا درکار ہے، یہ کہ اس سے خون صالح پیدا ہو جو جسم کو اعمال صالح کی تحریک کرے حرام اور ناپاک غذا سے جو خون پیدا ہوگا وہ لازماً اعمال بد کے لئے محرک ثابت ہوگا۔ جبھی تو حضور اکرمؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو گوشت حرام غذا سے بنا ہے وہ آگ ہی کے لئے موزوں ہے" لہٰذا طالب صادق کو اکل حلال کا اہتمام کرنا چاہیئے یہ بات بھی یاد رکھیئے کہ حلال کے ساتھ طیب کی قید بھی موجود ہے یعنی حلال بھی اور پاک بھی ہو۔

غذا کے بعد سیرت وکردار پر دوسرا بڑا مؤثر صحبت ہے اس کے دو پہلو ہیں ایک تو نا اہلوں کی صحبت سے پرہیز اور یہ پہلو نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ تعمیر کی نسبت تخریب کا عمل جلد بھی ہوتا ہے اور آسان بھی ہوتا ہے چنانچہ ایک شخص رات بھر اللہ اللہ کرتا ہے مگر دن کو چند لمحے اگر نا اہلوں اور بدکاروں کی صحبت میں گزارے تو اس کی رات بھر کی کمائی چند لمحوں میں ضائع ہو جائے گی۔ اس سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ تصوف دراصل رہبانیت اور ترک دنیا کی ایک صورت ہے بلکہ اس پرہیز کے لئے بھی ایک اصول ہے وہ یہ کہ جو شخص

سیرت کے اعتبار سے اتنا پختہ اور قوی ہو کہ بُرے لوگوں کی اصلاح کر کے انہیں اپنے رنگ میں رنگ سکے اس لئے یہ پرہیز سرے سے جائز نہیں ہاں جو شخص ایسا کمزور ہو کہ ہر آوارہ مزاج آدمی اس کی باطنی دولت پر ڈاکہ ڈال کر اس کو اپنے رنگ میں رنگ لے اسے اپنی حفاظت کی خاطر ایسے چوروں اور ڈاکوؤں سے بچ کے رہنا چاہیئے۔ قوی سیرت کا شخص اگر بُرے لوگوں پر کوئی مستقل اثر پیدا نہ کر سکے تو اس کی ہیبت سے کم از کم اتنے وقت کے لئے وہ لوگ بُرائی سے بچ رہیں گے جب تک ان کی صحبت میں بیٹھے ہیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ صحبتِ بد سے صرف بچنے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ صالح لوگوں کی تلاش کر کے ان کی صحبت میں بیٹھنے کا اہتمام بھی کیا جائے کیونکہ صرف تخریب سے بچنا ہی ضروری نہیں بلکہ تعمیر کا عمل جاری رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ قرب اور ترقی کی طرف قدم بڑھتے رہیں۔

کمزور لوگوں پر صحبتِ بد کا اثر کئی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً اس کی عبادات پر اثر پڑتا ہے اور سستی ہونے لگتی ہے۔ ذکرِ الٰہی میں جی نہیں لگتا اور یہ دونوں اثرات دراصل اس کی روح پر پڑے اور بدن سے یہ آثار ظاہر ہوئے۔ روح بیمار ہوئی تو عبادات اور ذکرِ الٰہی جو روح کی غذا تھی اس سے دل اچاٹ ہو گیا۔ یہ ذکرِ الٰہی یہ اخذِ فیض یہ جذب انوارات روح کی غذا اور اس کی بقا کا سبب ہے پھر اس سے بے رغبتی کیوں ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح مسلسل بخار کی وجہ سے منہ کا ذائقہ بدل جاتا ہے ایسے بیمار کے منہ میں شہد ٹپکاؤ تو وہ کڑواہٹ محسوس کر کے تھوک دے گا۔ اسی طرح روح جب بیمار ہو جاتی ہے تو اس کا ذائقہ بدل جاتا ہے عبادت اور ذکرِ الٰہی جیسی شیریں اور خوش ذائقہ غذا کڑوی محسوس ہونے لگتی ہے بلکہ اللہ کا نام لینا دشوار ہو جاتا ہے اور بات یہاں تک پہنچتی ہے کہ رحمۃ اللعالمین فرماتے ہیں میرے کان میں لا الٰہ الا اللہ کہہ دیں تمہاری نجات کا ضامن ہوں مگر اس سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا۔

ایک ذاکر جب صحبتِ بد سے نہ بچے تو رفتہ رفتہ اس کے وظائف اور اذکار رہ جاتے ہیں جیسے جسم ٹوٹ رہا ہو بخار نہ بھی تو آدمی کوئی ضروری کام ملتوی باندھے کر تو لیتا ہے مگر ذوق اور خوبی سے نہیں کر پاتا بس گذارہ کرتا ہے اور اگر بخار آ جائے تو ضروری کام بھی رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح جب حرام غذا سے خون میں حرام کی آمیزش ہو جائے یا انسان صحبتِ ناجنس کا شکار ہو جائے تو پھر اثر یہ ہوتا ہے کہ ذکر کرنے کو جی نہیں چاہتا اور اگر چندے یہی حال رہا تو نوافل کے بعد فرائض پر زد پڑتی ہے پھر بھی تائب نہ ہو تو سب کچھ رہ جاتا ہے اور اس کے قلب کا تعلق اپنے رب سے ٹوٹ جاتا ہے

اکلِ حلال کا اہتمام اور صحبتِ بد سے احتراز کے بعد کرنے کا کام یہ ہے کہ پوری یکسوئی سے اور نہایت پابندی سے ذکرِ الٰہی کریں پوری قوت سے تیزی سے سانس کے ذریعہ ذکر کریں اس قوت اور تیزی سے دو اثر مرتب ہوتے ہیں اوّل تو جہ ایک مقصد پر مرتکز رہتی ہے دوم خون میں خاص گرمی پیدا ہوتی ہے۔

جو اخذ فیضان کے لئے اور جذب انوارات کے لئے ضروری ہے اگر یہ گرمی پیدا نہ ہو تو شیخ کی توجہ سے انوارات آتے تو ہیں مگر طالب کے قلب میں جذب نہیں ہو پاتے جب تک انوارات میں جذب نہ ہو منازل سلوک طے نہیں ہو سکتیں ہاں ذکر الٰہی کا ثواب ہوتا رہتا ہے محض ثواب ملنا اور بات ہے اور منازل قرب کی طرف بڑھنا اور بات ہے۔

آپ نے تصوف کی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ تمام سلسلوں میں مشائخ طالبوں کو تنہائی میں رکھتے ہیں، جنگلوں میں بھیج دیتے ہیں معاشرے سے جدا کر دیتے ہیں اس تدبیر سے ان کا ذہن ہر طرف سے کٹ کر ایک مرکز پر جم جاتا ہے اور یہ یکسوئی جذب انوارات کی استعداد پیدا کرتی ہے۔ مگر خامی یہ رہ جاتی ہے کہ آدمی معاشرے میں رہ کر جو اعمال کر کے اپنی سیرت کی تعمیر کر سکتا ہے ان اعمال سے محروم ہو جاتا ہے۔ مگر ہمارے سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کی خصوصیت یہ ہے کہ معاشرے سے الگ نہیں کیا جاتا ہر قسم کے مساعد اور نامساعد حالات اسے پیش آتے ہیں مگر جب شیخ کی مجلس میں آتا ہے تو سارے غبار دھل جاتے ہیں یہ اس سلسلے کی برکت اور شیخ کی قوت کا اثر ہے بہرحال سلسلہ ہے جو مخلوق کے ساتھ اختلاط سے منع نہیں کرتا۔ کاروبار کرو دکان چلاؤ، ملازمت کرو، بیوی بچوں میں رہو، بس مقررہ اوقات پر مقررہ طریقے سے ذکر کرتے رہو، تمہارا سینہ منور رہے گا۔ ہاں اگر ان تینوں امور کا خیال نہ رکھا جائے تو لازمی امر ہے کہ ذکر الٰہی کے لئے فرصت نہ ملنے کا بہانہ بھی ہوگا جی نہ لگنے کا شکوہ بھی ہوگا۔ مگر یہ مرض لاعلاج نہیں ہاں علاج کے لئے محنت درکار ہے، وہ یوں کہ دھوبی پٹڑا سے کام لے یعنی نہایت قوت کے ساتھ تیزی سے لطائف کرے تاکہ خون میں جوش پیدا ہو اور غیر صالح غذا اور غیر صالح صحبت سے اجتناب کرے، گذشتہ سے توبہ کرے اور یہ یقین رکھے کہ کمی اوپر سے نہیں بلکہ خامی اور نقص طالب کی اپنی ذات میں ہے یہی حال شیخ کا ہوتا ہے شیخ کبھی یہ نہیں کرتا کہ کسی پر زیادہ توجہ کرے کسی پر کم اور کسی پر مطلق توجہ ہی نہ کرے شیخ کی توجہ سب پر یکساں ہوتی ہے فرق ہوتا ہے لینے والے کے ظرف میں۔ اس کا گریبان ہی چاک ہو۔ دامن ہی نہ رکھتا ہو تو جھولی کیونکر بھرے۔ کوئی شکوہ کرے تو بے جا ہے اور اگر چند کلیوں پر قناعت کرے تو کم ظرف ہے۔ ورنہ یہاں تو علاج تنگیٔ داماں بھی ہے۔

جہاں یکسوئی میں کمی بیشی کا تعلق ہے اس میں فطرت کو بھی دخل ہے۔ ذہین آدمی کا دماغ ہر وقت مصروف رہتا ہے اور اس کی توجہ بیک وقت کئی باتوں کی طرف رہتی ہے۔ ایسے لوگوں کا کامل یکسوئی مشکل سے حاصل ہوتی ہے عام اور سادہ آدمی میں یہ بات کم ہوتی ہے اس وجہ سے اسے یکسوئی زیادہ ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا پاگل لوگوں کو کشف ہو جاتا ہے گذشتہ واقعات اور دور کی باتیں بیان کرتے ہیں لوگ انہیں ولی کامل سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ یہ سب کچھ اس یکسوئی کی وجہ سے ہوتا ہے جو انہیں پاگل ہونے کی وجہ سے حاصل ہو جاتی ہے مگر عالم بالا کے حالات اس کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ مولانا تھانوی نے لکھا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ بچوں عورتوں اور کم عقل لوگوں کو جلد کشف ہو جاتا ہے۔ کشف صحیح بلاشبہ اللہ کی

نعمت ہے مگر یہ قبولیت کی دلیل نہیں، مگر بعض کوتاہ اندیش لوگ اسے عنداللہ مقبولیت کی دلیل سمجھ کر محنت ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے کشف الٹا حجاب بن جاتا ہے۔

دوسرا نقص یہ ہوتا ہے کہ صاحب کشف اپنی طرف کمال کی نسبت کرنے لگتا ہے اس کے مقابلہ میں وہ شخص فائدے میں ہے اور محفوظ ہے جسے کشف نہیں ہوتا کیونکہ وہ اس کمی کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ اگر اس کے ذوق میں کمی آجائے تو وہ اپنی کمزوری سمجھتا ہے اس لئے خود بینی سے محفوظ رہتا ہے۔

ذکر الٰہی میں سستی اور لطائف کی اہمیت کا اندازہ صحیح طور پر برزخ میں ہوگا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ سے ایک روز بات ہوئی تو فرمانے لگے مجھے ۱۲ برس کی عمر باقی، مرض الموت میں چار دن مجھ سے لطائف کرنا چھوٹ گیا جس کا مجھے اب بھی افسوس ہے۔ حالانکہ آپ کے منازل عالم امر میں ہیں آپ منازل کے اعتبار سے ان چند گنے چنے افراد میں سے جنہیں سلوک میں منازل کی بلندی حاصل ہوئی۔ مگر یہاں کیا ہوتا ہے چند روز لطائف پر زور دیا پھر گھگو بنکر بیٹھ گئے۔ حضرت صاحب بن بیٹھے ہیں سلوک کی تکمیل ہوگئی اب زور سے لطائف کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی، محنت کرنا چھوڑ دیتے ہیں، تقریر سننا گوارا نہیں ہوتا۔ درس قرآن جو صبح ہوا کرتا ہے اس میں شامل نہیں ہوں گے بس کشف نے انہیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ بلکہ شیخ سے بھی مستغنی ہو جاتے ہیں یہ نہیں جانتے کہ ڈور شیخ کے ہاتھ ہوتی ہے، یہاں یہ بات نہیں کہ علم ظاہر میں چند کتابیں پڑھ لیں اور استاد سے بے نیاز ہو گئے یہ الفاظ کا معاملہ نہیں کیفیات کی بات ہے، کیفیات ہمیشہ تعلق قائم رہنے ہی سے رہتی ہیں، لوہا جب تک آگ میں ہے وہ آگ بن جائے گا جونہی آگ سے جدا ہوگا وہ کیفیت زائل ہوگئی اس لئے جو شخص منازل سلوک میں جتنا ترقی کرتا جائے اتنا ہی محتاط ہونا ضروری ہے محنت میں کمی نہ آنے دے میں نے دیکھا ہے لوگ ابتدا میں لطائف میں اتنا جوش دکھاتے ہیں کہ ہمیں چلنے سے بیٹھنے نہیں دیتے ہیں ایسے ہی لوگ ہیں کہ ذکر الٰہی میں پابندی جاتی رہی کرتی نہ کوئی بہانہ تیار ہوتا ہے یہ ہوگیا وہ ہوگیا۔ مجبوری تھی وقت نہیں ملا وغیرہ اس لئے ذکر الٰہی سے سیکھنے سے اور شیخ سے یہ استغنا طالب کے لئے موت ہے۔

شیخ کے ساتھ طالب کا تعلق اس انداز کا ہونا چاہیئے جو صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں نظر آتا ہے۔ حضرت خبیبؓ کو اہل مکہ نے سولی پر لٹکایا۔ ان کی عادت یہ تھی کہ مسلمانوں کو سولی پر لٹکا کر اذیتیں دے دے کر مارتے تھے ایسی ضرب نہیں لگاتے تھے کہ فوراً مر جائے حضرت خبیبؓ یہ اذیتیں سہتے اور اپنے رب سے محو گفتگو تھے کہ الٰہی اس جم غفیر میں کوئی ہمدرد نظر نہیں آتا، تو میری حالت دیکھ رہا ہے۔ یہ اسلام میرے محبوب کو پہنچا دے اور میری حالت حضورؐ کو بتا دے، تعلق قلبی اس کا نام ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ طاعت و ذکر کے لئے دعوت ملے اور آدمی کہے بیوی کو زکام ہوگیا شیخ کے پاس حاضر نہیں ہو سکتا۔

میاں کب تک پیشاب کی بوتل لیئے پھرو گے کیا یہی لے کر قبر میں جاؤ گے کہ اللہ! بیوی بیمار تھی قارورہ پاس ہے، میں کیونکر تیری عبادت اور تیرا ذکر کر سکتا ہوں۔ یہ کوئی عذر شرعی نہیں ہے۔ کون بیمار نہیں ہوتا حضرت جو مہینہ بھر سے گھر چھوڑ کے یہاں آئے بیٹھے ہیں کیا ان کو دنیا کا کوئی کام گھر میں نہیں ہے۔ جن دنیوی مشکلات میں آپ پھنسے ہوئے ہیں۔ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے اس کے باوجود آپ پورا وقت اجتماع کے لیے دے سکتے ہیں۔ مگر ہم ہیں کہ بہانہ سازی کی فیکٹریاں کھول رکھی ہیں۔ بیوی آپ کی راہ میں ہمالیہ بن کر کھڑی ہو گئی ہے مگر اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ایک ایک عورت چار چار مردوں کو دوزخ میں لے جانے کا سبب بنے گی۔ سب سے پہلے باپ سے پرسش ہو گی کہ تیرے گھر میں پلی بڑھی تو نے اسے دین کیوں نہیں سکھایا پھر بھائی سے پوچھ گچھ ہو گی کہ تیرے ساتھ پرورش پائی تو نے اسے دین کیوں نہیں سکھایا اسی طرح خاوند سے پھر اولاد سے جواب طلبی ہو گی۔ آخر وہ ایک عورت ان چاروں کو اپنے ہمراہ دوزخ میں لے جائے گی مجبوری یہ ہے کہ گو ہم مشکل وگرنہ گوئم مشکل مگر بات کھری ہے کہے بغیر چارہ نہیں۔ ہم نے یہ بارہا تجربہ کیا کہ جب کبھی تبلیغی دورے پر نکلتے ہیں کوئی مشکل سر نکال لیتی ہے بچہ بیمار ہو گیا۔ بیوی بیمار ہو گئی کوئی اور افتاد آپڑی۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ سب عطا کا ایک بہانہ ہے۔ اللہ کریم کچھ دینا چاہتے ہیں۔ مگر اصول یہ ہے کہ لینے کے لیئے حرکت بندے کی طرف سے ہو۔ لہٰذا یہ مجبوریاں تمہیں روکنے کے لیئے نہیں ہوتیں بلکہ امتحان ہوتا ہے کہ تم اپنا وزن اپنی آزاد مرضی سے کس پلڑے میں رکھتے ہو۔ اسے محرومی کا بہانہ بناؤ گے یا عطا کا بہانہ سمجھ کر دین کے لیئے آگے بڑھو گے۔ مختصر یہ کہ تین باتوں کا ہمیشہ خیال رکھو

اوّل: ہر حال میں متوجہ الی اللہ رہو۔

دوم: حلال اور طیب غذا کا اہتمام کرو۔

سوم: یہ کہ نا اہلوں کی صحبت سے پرہیز کرو۔

تنہائی کا احساس ہو تو کسی دینی اخلاقی اصلاحی کتاب کا مطالعہ کرو ذکر الٰہی میں مصروف رہو۔ نا اہلوں کے ساتھ بیٹھنے سے تو سو رہنا بہتر ہے۔ ان احتیاطوں کے ساتھ صبح و شام دونوں وقت پابندی سے ذکر کرو۔

اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ان اوقات میں حضور اکرم ﷺ سے لے کر جو سلسلہ مشائخ کا چلتا ہے سارے مشائخ ان اوقات میں طالبوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں

اللھم ارزقنا حبك وحب حبيبك
وحب عمل يقربنا الى حبك

مسلسل

پروفیسر عبدالرزاق صاحب ایم۔اے

# تصوّف اور تعمیر سیرت

## اذکار اور اشغال کی حقیقت

**مراقبۂ اقربیت:۔** یہ تیسرا مراقبہ ہے۔ قریب اور اقرب میں فرق ہے۔ جو چیز سب سے زیادہ قریب ہو اُسے اقرب کہتے ہیں گویا یہ قرب کا انتہائی درجہ ہے اس مراقبہ کے دوران یہ وظیفہ پڑھا جاتا ہے کہ:

نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَيۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِيۡدِ۔

یعنی اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ ہم بندے سے اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہُوا کہ قرب بندہ کی طرف سے نہیں ہوتا کیونکہ وہ ذات ۔ وراء الوریٰ ہے بندہ اس حد تک کیسے پہنچے مگر وہ ذات خدا اپنی رحمت سے بندہ کے قریب ہو جاتی ہے دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ وہ قریب ہی نہیں اقرب ہے بندہ کو قرب و بعید کا احساس ہی جان کی وجہ سے ہوتا ہے ایک جسم بے جان کو کسی کے قُرب و بُعد کا کیا احساس ہو سکتا ہے گویا قرب کا احساس دینے والی چیز ہی بندہ کے سب سے زیادہ قریب ہے مگر وہ تو فرماتا ہے کہ میں رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہوں۔ اس قرب کا تصور کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ دیکھئے آپ ایک لفافہ لے کر اس پر ٹکٹ چسپاں کرتے ہیں پہلے وہ ٹکٹ کہیں دُور پڑا تھا اب لفافے پر چسپاں ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اب وہ لفافے کے قریب ہی نہیں بلکہ اقرب ہے مگر سوچئے ایک چیز ایسی بھی ہے جو اس ٹکٹ کی نسبت بھی لفافے کے زیادہ قریب ہے اور وہ ہے گوند جس نے ٹکٹ کو لفافے پر چسپاں کیا گو ظاہر ہے ٹکٹ اقرب ہے اس طرح رگِ جاں انسان کے زیادہ قریب ہے۔ مگر حقیقت وہ ذات ہے جس نے رگِ جان میں جان ڈالی وہ اس سے بھی زیادہ قریب ہے۔

قرب کی حقیقت پر مولانا تھانوی ؒ کے الفاظ سنیئے:۔

"قرب کے مختلف درجات ہیں ایک تو قرب حقیقی ہے جس کا ترجمہ مِل جانے سے کر دیا اور ایک حقیقت سے سو قرب حقیقی تو کسی کو حق تعالےٰ کے ساتھ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ جسم اور مکان سے پاک ہے اور ادراک حقیقت بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ ادراک احاطہ چاہتا ہے۔ ممکن، بھلا واجب کا ادراک کیونکر کر سکے انتہا

قرب سے مراد قرب حقیقی تو نہیں ۔

دوسرا ہے قرب مجازی جس کا حاصل حجابات کا اٹھ جانا یا کم ہو جانا ہے ایک تو قرب علمی جو اللہ تعالے کے ساتھ ہر چیز کو حاصل ہے ۔ "

ایک ہے قرب کا تعلق خصوصیت جیسے ہم کہتے ہیں تم دور رہ کر بھی پاس ہو ۔ یعنی تم سے ہمارے دل کا خاص تعلق ہے ۔ ۔ ۔ ۔

قرآن مجید سے جو قرب مطلوب ہے اور جسے اولٰئک المقربون میں انسانیت کا بلند ترین مقام قرار دیا گیا ہے وہ کمال ایمان اور کمال دین ہی کا نام ہو سکتا ہے اسی کا قرآنی نام قرب ہے ۔ ۔ ۔ یعنی کمال دین جب وہ امر طبعی کا سا حال بن جائے کہ دینی زندگی اور دینی احکام کی اطاعت طبیعت بن جائے اور زندگی کی ہر حرکت و سکون میں وہی بات بالطبع پسند ہو اور کرنے کو جی چاہے جو خدا تعالے کو اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہو، اور اس میں اسی کی رضا ہو ۔ تو اصل مقصود رضا ہے جو وصول یا قرب حق تعالے کی رضا کے ساتھ نہ ہو وہ مقصود نہیں ۔ "

" وصول کی صورت یہ ہے کہ ابتدا میں تو سالک میں اور محبوب حقیقی میں غیر متناہی مسافت ہوتی ہے جسے سالک طے نہیں کر سکتا مگر جب یہ چلنا شروع کر دیتا ہے تو حق تعالے اس کے ضعف پر رحم فرماتے ہیں کہ اتنی لمبی مسافت ان سے قطع نہ ہوگی ۔ اب وہ خود چلنا شروع کر دیتے ہیں اور ان کو اس مسافت کا طے کرنا کچھ بھی مشکل نہیں تو وہ خود اس کے نزدیک آجاتے ہیں ۔ "

( اور مژدہ سناتے ہیں نحن اقرب من حبل الورید )

" یہی صورت سالک کے باطن کی ہے کہ اول تم اپنی ناتمام سعی اور طلب ظاہر کرتے ہو تمہاری وہ سعی ہرگز وصول کے قابل نہیں تھی مگر جب تم دو قدم چل کر گر پڑتے ہو اس وقت حق تعالے کی رحمت کو جوش آتا ہے اور خود آکر گلے لگا لیتے ہیں (جیسے شیر خوار بچہ چلنا شروع کرتا ہے گر پڑتا ہے، آپ دوڑ کر اسے اٹھا لیتے ہیں ۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ بچہ کی طرح ایک دو قدم چل کر رونا تو شروع کرو ۔

یہ حق تعالے کا اقرب ہونا اور یہ بتانا کہ میں اقرب ہوں محض ایک شغل نہیں بلکہ ایک حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ میں وہ ہوں جس نے حبل الورید میں جان ڈالی تمہاری نشوونما کی تمہیں طرح طرح کی صلاحیتیں بخشیں تمہیں ایک عظیم الشان ڈیوٹی سونپی تمہیں اپنا نائب بنایا ۔ اب میں اتنا قریب ہوں کہ تمہاری ہر حرکت دیکھ رہا ہوں، نہیں بلکہ تمہارے دل کی گہرائیوں میں جو خیالات موجزن ہیں ان سے بھی باخبر ہوں ۔ اس داد و دہش اور اس امانت کا امین بنا دینے کے بعد اس کے متعلق باز پرس بھی کروں گا ۔ اس کا مواخذہ بھی ہوگا اور میں ایسا علیم و خبیر ہوں کہ تمہاری کوئی حرکت اور کوئی ارادہ مجھ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا اور میرے یہاں نہ کوئی بہانہ چلے گا، نہ رشوت میرے اس نعمت کا تقاضا یہ ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہو اور میری اس قدرت کا تقاضا یہ ہے کہ تمہیں میری ناراضگی کا خوف ہو مگر خوف کا جذبہ بعد میں پیدا ہو محبت کے جذبے کو اولیت حاصل ہے ۔ اس لئے مجھے اپنا محبوب بناؤ اور خوش ہو جاؤ کہ محبوب تمہارے اتنا قریب ہے کہ اس سے

زیادہ قرب کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہی اس قربِ قیمی کا مقتضی ہے اور اس مقتضیٰ پر سالک کی عملی زندگی استوار ہوتی ہے۔

قرب و بعد کا لفظ آتے ہی انسان کا ذہن فوراً مادی فاصلوں کے متعلق ہی سوچنے لگتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ جو ذات ان حدود سے آزاد ہے اس کے لئے ان حدود کا تصوّر کیوں کیا جائے کسی مجردِ حقیقت کے بیان کے لئے الفاظ ساتھ نہیں دے سکتے مگر شریعت اسلامیہ ہماری تفہیم کے لئے ایسا اندازِ بیان اختیار کرتی ہے کہ حقیقت کی جھلک ہمارے ذہن کی گرفت میں آ سکے مگر انسان پیکر تراشی شروع کر دیتا ہے۔

مادی کا قرب مادی سے یقیناً مکانی ہوتا ہے۔ مگر مجرد کا قرب مجرد سے یا مجرد کا مادی سے مکانی قرب نہیں ہوتا مگر ان دونوں کا اثر پہلے قرب کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتا ہے مثلاً باپ اور بیٹا مکانی اعتبار سے ایک دوسرے سے سینکڑوں میل دور ہیں اور دو اجنبی ایک دوسرے کے پاس بیٹھے ہیں مگر باپ بیٹے میں اتنی دوری کے باوجود جو قرب ہے وہ ان دو اجنبیوں کو حاصل نہیں قرب مکانی کا رشتہ تو بڑا ہی کمزور قسم کا رشتہ ہے اسی لئے قرب کی ہر تعبیر کو زمان و مکان کی قیود میں محدود کر دینا بڑی کوتاہ نظری ہے اللہ تعالیٰ اپنے اطاعت شعار بندے کے اتنا قریب ہے کہ اس کی شاہ رگ بھی اتنی قریب نہیں مگر یہ قرب وہی ہے جو مجرد کو مادی سے ہو سکتا ہے وہ نہیں جو مادی کو مادی سے ہوتا ہے۔

سالک جب اس راہ پر قدم بڑھاتا ہے تو یہ قرب دیدۂ باطن سے اسی طرح دیکھ لیتا ہے جیسا کہ کوئی دیدۂ ظاہر سے محسوسات کا مشاہدہ کرتا ہے۔

مراقبات ثلاثہ ختم ہوئے پھر مراقبات راسخ ہو جائیں تو سالک کا اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان مستحکم ہو جاتا ہے توکل علی اللہ کا وصف پختہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی حکمت کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے۔ اصول تجویز کے تحت زندگی بسر کرنے کی پریشانیوں سے نجات ملتی ہے اور اصول تفویض کی پُر بہار فضاؤں میں رہ کر پُرسکون زندگی بسر کرنے کا تجربہ ہوتا ہے کسی فیصلے کے خلاف لب کشائی تو کجا دل میں شکایت کا تصوّر بھی نہیں آتا۔ اس کی معیت کا احساس ایک طرف باطل کے مقابلے میں جری بنا دیتا ہے۔ دوسری طرف بے راہروی کے سامنے ایسی رکاوٹ کا کام دیتا ہے کہ اس سمت قدم اٹھنے ہی نہیں پاتے اور محبوب کے قرب کا احساس محبت کے جذبے کو ابھارتا ہے اور سالک اس راہ پر گامزن ہوتا ہے جس کی نشان دہی ان الفاظ سے کی گئی کہ

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ

اَللّٰھُمَّ ارزقنا حبّک وحبّ من یحبّک۔

(باقی آئندہ)

# "خدایا ایں کرم بارِ دگر کن"

حافظ عبدالرزاق ایم۔اے

(زیارت حرمین کے تاثرات)

## جبلِ رحمت

جبلِ نور سے چلے تو جبلِ رحمت کا رُخ کیا۔ یوں تو اسم اور مسمی میں مناسبت کا خیال بہت کم رکھا جاتا ہے لیکن یہاں تو پہاڑوں کے ناموں میں بھی خاص مناسبت کا التزام پایا جاتا ہے۔ عرفات کے وسیع و عریض میدان میں ایک پہاڑی ابھرتی ہوئی کھڑی ہے اس کی چوٹی پر ایک پتھر نصب ہے جیسے سنگِ میل ہوتا ہے۔ اس پہاڑ کو جبلِ رحمت کہتے ہیں۔

کیوں کہتے ہیں؟ اس کی وجہ شاید یہی ہو کہ محسنِ انسانیت کو جس مقصد کے لئے بھیجا گیا اس کی تکمیل کا اعلان اسی مقام پر ہوا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لئے اپنے آبائی وطن تشریف لائے عرفات کے میدان میں ایک لاکھ سے زائد کا مجمع تھا۔ بیشتر وہ لوگ تھے جو برسوں اس مرکزِ اعظم کے زیرِ تربیت رہے۔ کچھ وہ تھے جنہوں نے دیر کے بعد حقیقت کو پہچانا۔ مگر سب نے رُخِ انور کو دیکھا یعنی سارے کے سارے صحابی تھے۔ یہ

وہ اعزاز ہے جو آفتاب عالمتاب کے اوجھل ہو جانے کے بعد کسی کو نہ مل سکا۔ یہ وہ ڈگری ہے جو اس یونیورسٹی کے بغیر اور کہیں نہیں مل سکی۔ یہ وہ تمغہ ہے جو اس دربار کے بغیر اور کہیں سے مل نہ سکا۔ تو ان تمام مقدس [illegible] نے اس لاثانی معلم نے اس مقام رفیع پر ایک بات پوچھی! جو مقدس امانت میرے رحیم نے تمہیں پہنچانے کے لیے میرے سپرد کی تھی کیا تم شہادت دیتے ہو کہ میں نے پہنچا دی؟ بھلا اس کا جواب نفی میں بھی ہو سکتا تھا۔ جواب سن کر اپنے خالق سے مخاطب ہو کر کہا اللہ تو خود شاہد ہے اور اس گواہی کو بھی سن رہا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ امانت تو تمہیں پہنچ گئی میرا فرض پورا ہوا مگر تمہاری ڈیوٹی باقی ہے اور رہے گی۔ وہ کیا فلیبلغ الشاھد الغائب۔

یہ امانت تالے لگا کر رکھنے کی چیز نہیں یہ دولت تو بانٹنے کے لئے ہے یہ خزانہ تو تقسیم کرنے بلکہ لٹانے کے لئے ہے اس لئے ہر حاضر کا فرض ہے کہ اسے اس تک پہنچائے جو موجود نہیں ہے۔ چراغ سے چراغ جلتا چلا جائے۔ اور یہ سلسلہ قیامت تک چلا جائے۔ رحمۃ للعالمین نے ۲۳ برس رحمت بانٹنے میں صرف کئے آج اس کی تکمیل ہو رہی ہے اور رحمت سے جھولیاں بھر کے لے جانے والوں کو تاکید ہو رہی ہے کہ یہ سلسلہ رکنے نہ پائے رحمت کی تقسیم ہو عام ہو ظرف کی مناسبت سے ہو حکمت کا لحاظ رکھا جائے۔ چھوٹے پن کا اظہار نہ ہو۔ کام ہو سلیقے سے ہو۔ قرینے سے ہو۔ رحمۃ للعالمین کیا اپنی طرف سے یہ اعلان فرما رہے ہیں؟ نہیں یہاں تو کہا نہیں جاتا کہلوایا جاتا ہے۔

وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحی اس لئے ادھر سے اشارہ ہوا کہ

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔

رب رحیم سے تکمیلِ رحمت کا اعلان ہو رہا ہے۔ رحمۃ للعالمین کی زبان حق ترجمان سے اعلان ہو رہا ہے اور رحمت کے نصاب کلام الٰہی کی تکمیل کا اعلان ہو رہا ہے۔ ھدی و رحمۃ للمحسنین اور اسلام کے نام رب رحیم کے پسندیدہ ضابطہ حیات کی تکمیل کا اعلان ہو رہا ہے پھر اس پہاڑ کا نام جبلِ رحمت نہ ہو تو اور کیا ہو۔ کس قدر مسرت و شادمانی کا موقع ہے کتنی خوشی کا مقام ہے۔ مگر پاس ہی ایک دُبلا پتلا شخص دکھائی دیتا ہے جس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہے۔ ساتھی پوچھتے ہیں ابوبکر تم تو صدیق ہو۔ تم تو یارِ غار ہو۔ تم تو ثانی اثنین ہو۔ تم تو مزاج شناس نبوت ہو۔ تم تو حقیقت شناس ہو۔ اس خوشی کے موقع پر یہ آنسو کیا خوشی کے آنسو ہیں؟ جواب ملتا ہے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ خوشی کا موقع ہے مگر مجھے یہ بھی تو بتاؤ کہ دنیا میں کوئی خوشی ایسی بھی ہے جس میں رنج کی آمیزش نہ ہو؟ اس لئے ذرا سوچو کہ جب کام مکمل ہو گیا تو جسے کام کے لئے بھیجا گیا تھا کیا اسے واپس بلا نہ لیا جائے گا؟ اور جب اسے بلا لیا گیا تو کیا یہ آنکھیں بے نور ہو کر نہ رہ جائیں گی۔ اس آفتاب کو چمکنا ہے ہی مگر یہ آنکھیں اسے کب دیکھ سکیں گی۔ یہ چمکتا رہے گا۔ اس کی ضیا پاشی رک نہیں سکتی۔ ضیا پاشی اس کا طبعی وصف ہے اس کی خصوصیت:

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر ڈوبے ادھر نکلے

یہ تو مصدہ ایمان ہے یہ تو مقصدِ ایمان ہے یہ چمکتا رہے گا مگر ابوبکر کی آنکھیں جو نہ دیکھ سکیں گی پھر آنسو روکنا بھلا صدیق کے بس کا کام ہے:

من چہ گویم از تو لالیش کہ چیست
خشک چوبے در فراق او گریست

اس صدیق کی آنکھیں کیونکر اشکبار نہ ہوتیں جس کی خصوصیت ہی یہی تھی کہ:

بکوئے تو گداز یک نفس بس
مرا ایں ابتدا ایں انتہا بس
خراب جرأت آں رند پاکم
خدا را گفت مارا مصطفیٰ بس

جس نے ابوبکر کو صدیق بنایا جس کی نگاہ نے صدیق کے دل میں عشق کی چنگاری رکھ دی، جس کی تربیت نے صدیق کو سراپا سوز بنا دیا، جب اس کے فراق کا وقت قریب آرہا ہے تو صدیق کی آنکھ کیوں نہ روئے۔

محبت از نگاہش پائیدار است
سلوکش عشق و مستی را عیار است
مقامش عبرۂ آمد ولیکن
جہانِ شوق را پروردگار است

# چوتھا عمرہ

۱۴۲۷ھ آج چوتھا عمرہ کیا گیا یہ انسانی کمزوری اور نگاہ کی نارسائی ہے کہ وہ صرف مظاہر ہی میں الجھ کر رہ جاتا ہے مادیات سے آگے روح کے متعلق سوچنا اور صورت سے نکل کر حقیقت تک پہنچنا بدیر یا مشکل ہی تیسر آتا ہے۔ مادی تعلقات خواہ کیسے ہی قریبی کیوں نہ ہوں وہ تعلق جو روح اور قلب سے ہوتا ہے اس کا بدل کیسے ہو سکتے ہیں اعزہ اور اقارب کے احسانات خواہ کتنے ہوں مادی اور فانی فوائد تک ہی محدود ہوتے ہیں ایسا محسن جس کی ذات سے روحانی، اخلاقی اور غیر فانی اور ابدی فوائد حاصل ہوں، اس کا شکر گزار ہونا اور اس کا حق ادا کرنا اتنا ضروری ہے کہ اسے ہر حال میں اولیت، حاصل ہو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر احسان بھلا کس کا ہو سکتا ہے؟

بچشم من نگاہ آوردہ تست
فروغ لا الہ آوردہ تست

افسوس کہ اس نابکار نے اس کام کو متاخر کر دیا جو سب سے پہلے کرنا تھا۔

یا نفس لا تقنطی من زلۃ عظمت
ان الکبائر بالغفران کاللمم

چنانچہ آج ہادی برحق محسنِ حقیقی، شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کی نیت سے عمرہ کیا گیا۔

اللّٰھم تقبل منا مع جمیع النقصان
بحرمت نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم

ادائے عمرہ کے دوران دعاؤں کے ساتھ کچھ تمنائیں بھی اور آنسوؤں کے ساتھ کچھ آہیں بھی نکلتی رہیں، اور جب نظام یاد آ گئے:

صبا بہ سوئے مدینہ روکن ازیں دعاگو سلام برخواں
بگرد شاہ مدینہ گردد بہ صد تضرع پیام برخواں
بہ شوز من صورتِ مثالی نماز گداز اندر آنجا
بہ لحن خوش سورۃ محمدؐ تمام اندر قیام برخواں
بہ باب رحمت گہے گزر کن بہ باب جبریل گاہ جبیں سا
سلام ربی علی نبیّ گہے بہ باب سلام برخواں
بنہ بہ چندیں ادب طرازی سر ارادت بخاک آں کوی
صلوٰۃ وافر بہ روح پاک جناب خیر الانام برخواں
بہ لحن داؤد ہمنوا شو بہ نالہ و درد آشنا شو!
بہ بزم پیغمبر ایں غزل را ز عبد عاجز نظام برخواں

عمرہ کے تمام ارکان کرنے کے بعد رب العالمین کے حضور درخواست کی کہ اس عاجز کا یہ حقیر ہدیہ رحمۃ للعالمین کی روح اقدس تک پہنچ جائے۔

ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
کشتی و دریاؤ طوفانم توئی

آہوئے نار و زبون و ناتواں!
کس بفتراکم نہ بست اندر جہاں

اے پناہ من حریم کوئے تو
من بامیدے رمیدم سوئے تو

اے وجود تو جہاں را نو بہار
پرتوِ خود را دریغ از من مدار

پچھلے پہر کچھ وقت ملا اور دو طواف کر لئے۔ اللّٰھم زد فزد۔

۱۵ ۳/۷۷ آج پانچواں عمرہ کیا اور اپنے وہ محسن جنہوں نے میری جسمانی و عائلی تربیت کی ان کی طرف سے ادا کیا۔

اللھم رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا۔

اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور ان کے مدارج بلند کرے۔ (آمین)